داغوں کی بہار

اختر سلیمی

حسن کار، لاہور

داغوں کی بہار

ناول

تقسیم کار:

جدید ناشرین - چوک اُردو بازار - لاہور

داغوں کی بہار

اختر سلیمی

حسن کار۔ اشاعت گھر۔ لاہور

مصنف

اختر سلیمی ۔ ۸ رسول لائینز، گوجرانوالہ ۔ فون: ۲۶۱۴

ناشر : .. .. حسن کار ۔ لاہور

طابع : .. .. نامی پریس ۔ لاہور

سرورق : .. .. محمد حلیم

کتابت : .. .. حفیظ قریشی

نقش اوّل .. .. .. سنہ ۱۹۶۶ء
قیمت : چار روپے آٹھ آنے



اختر سلیمی

اختر سلیمی کی دیگر تصنیفات

• ناول

سمندر اور لہریں

ہائے تنہائی نہ پوچھ

بجلیاں گرتی ہیں

افسانے

چاندنی اور زنجیریں

دبے پاؤں

صمیم

یادوں کے کھنڈر

• ڈرامے

جذباتی

چاندنی اور زنجیریں

• داستانیں

زنداں روتا ہے

نیا سفر

• دست شناسی

فنِ دست شناسی

• سیاسیات

خسروِ مشرق

نئے ستون

انقلابی حکومت

• پنجابی افسانے

لمیاں اڈیکاں

بڑے پیار اور انتہائی عقیدت کے ساتھ

شفیق بھائی

مخلص دوست

اور

عظیم انسان

عارف عبد المتین کے نام!

مقدّمہ

"داغوں کی بہار" اختر سلیمی کی سادگی و پُرکاری کا ایک دلآویز نمونہ ہے!

اگرچہ شروع سے آخر تک اختر سلیمی کے اس ناول کا مرکزی کردار (دیپک) مختلف لڑکیوں سے محبت کی پینگیں بڑھانے میں مصروف رہا ہے تاہم اس کے اس شغلِ بے پرواہی کے پس پردہ جو ڈرامہ کھیلا گیا ہے، وہ ایک ایسے موضوع کا حامل ہے، جو خاصا سنجیدہ ہے، اور نفسیاتی اعتبار سے بڑی اہمیت کا مالک ہے!

اس ناول میں اختر سلیمی نے ایک ایسے کردار کو پیش کیا ہے، جو بالکل نوجوان ہے اور نوجوانوں کی طرح وہ ایک ایسی لڑکی سے محبت کرتا ہے، جو اُسے بھی چاہتی ہے لیکن معاشرتی پابندیوں اور صنفی مجبوریوں کی وجہ سے چاہنے کے باوجود اس کا ساتھ نہیں دے سکتی اور والدین اُسے کسی اور سے بیاہ دیتے ہیں —— اپنے پہلے پیار میں ناکام رہ کر دیپک کی طبیعت اکھڑ جاتی ہے اور وہ اپنی ناکامی کی اس تلخی کو بھلانے کے لیے کئی حربے استعمال کرتا ہے —— پہلا حربہ تو یہ ہے کہ وہ کسی جگہ نوکری کر لیتا ہے اور ساتھ ہی ایک ایسے کالج میں داخلہ لے لیتا ہے، جہاں لڑکیاں بھی زیرِ تعلیم ہیں اور یوں اپنے لیے مصروفیت اور دل بہلانے کی دوگونہ پناہ گاہ تعمیر کرتا ہے۔ —— دوسرا حربہ، جسے وہ بروئے کار لاتا ہے، یہ ہے کہ جب اس کا بھائی یورپ سے واپس آجاتا ہے اور اُسے زبردستی گھر لے جانا چاہتا ہے، جسے اوّلیں محبت

کے رانہ کے طشت از بام ہو جانے پر دیپک نے مجبوراً چھوڑ دیا تھا، تو وہ آمادہ ہو جاتا ہے اور نتیجہ کے طور پر روٹھے ہوئے والدین کو منا کر اس کی صلح کرادی جاتی ہے — اور تیسرا حربہ یہ ہے کہ وہ مذکورہ کالج میں پڑھتے ہوئے متعدد لڑکیوں سے روابط قائم کرلیتا ہے اور پھر ایک لڑکی کو پسند بھی کرلیتا ہے، لیکن وہ لڑکی اس کی شوخیوں اور شرارتوں میں دلچسپی لینے کے باوجود اُسے نہیں چاہتی اور آخر کار کالج کو چھوڑ کر چلی جاتی ہے اور — اور یوں زندگی سے چمٹنے کے یہ چاروں حربے اپنے نتائج کے لحاظ سے ناکام ہو جاتے ہیں اور اس کی زندگی کا گھناؤنا خلاء پُر نہیں ہونے پاتا — بالآخر تنگ آکر (لاشعوری طور پر) وہ ایک ایسی لڑکی کو اپنا لیتا ہے، جو اس سے محبت کا دم بھرتی ہے اور اُسے جنسی آسودگی بھی مہیا کرتی ہے لیکن مسلسل ناکامیوں نے اس کے مزاج میں ایک خاص قسم کا شک بھی پیدا کر دیا ہے اور وہ اس لڑکی (مینا) کے متنوع اور متضاد رویہ کو دیکھ کر محسوس کرتا ہے کہ یہ لڑکی اپنا جسم تو اس کے سپرد کر سکتی ہے لیکن عتیق (سب سے پہلی محبوبہ) کی طرح دل کا سودا نہیں کر سکتی اور یہ ایک حقیقت ہے جس کو وہ کسی بھی طرح قبول نہیں کرتا۔ اور اپنی اس بے وفا محبوبہ کو قتل کر دیتا ہے اور یہ اس کا آخری حربہ ہے اور اس حربہ کو استعمال میں لاکر وہ ایک ایسے انجام تک پہنچتا ہے، جو اُسے ان معنوں میں کامیابی سے ہمکنار کر دیتا ہے کہ وہ اس حقیقت کو پالیتا ہے کہ بے غرض محبت ایسے آئیڈیل کے دفاع کے لیے اگر محبوبہ، ایسی جان سے پیاری شے کو بھی قربان کرنا پڑے تو اس سے دریغ نہیں کرنا چاہیے اور واقعتاً وہ گریز کرتا بھی نہیں!

اختر سلیمی کی موجودہ تخلیق "داغوں کی بہار" اس کی ایک نہایت جامع کاوش کا درجہ رکھتی ہے کیونکہ اس میں اس نے بڑی خوبی سے تمام اہم کرداروں کو حالات و واقعات کی بھول بھلیوں سے گزارا ہے اور اس فرض سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اس کے قلم نے بھی اس کا پورا پورا ساتھ دیا ہے اور یوں فنی اظہار میں وہ نہ صرف کامیاب ہے بلکہ اس نے بڑی جرأت اور دلیری سے اپنی بے غرض محبت ایسے آدرشس کا تحفظ بھی کیا ہے !

صلاح الدین ندیم

۸ مئی ۱۹۶۶ء

پانی سمندراں دے
لگی یاری دو دِن دی،
نبھنے ساریاں عمراں دے

(۱)

کمرے میں مہیب سناٹا چھایا ہوا تھا !!

میں نقش فریادی بنا کھڑا تھا۔ گردن لٹکنے کے انداز میں جھکی ہوئی تھی۔ نظریں زمین پر بچھے قالین میں گھب رہی تھیں۔ کمرے کی نیم تاریکی میں میرے دونوں چچا سوچ میں غلطاں تھے۔ میرے پاپا ہونٹ بھینچے دانت پیس رہے تھے۔ ان کے چہرے سے غصہ کی ایک لہر ابھرتی اور ٹھوڑی کے ذرا ادھر ختم ہو جاتی۔ دھوپ شباب پر تھی۔ مگر اس کمرے میں ایک کرن بھی داخل نہیں ہو رہی تھی۔ کمرے کی فضا کچھ ایسی ڈرامائی سی ہو گئی تھی کہ عجیب الف لیلوی داستاں کا منظر دکھائی دیتا تھا۔ خاموشی اس قدر گہری جیسے کائنات میں یہی ایک کمرہ ہو۔ اور اس کمرہ میں میں مبہوت پتھر کا بت بنا کھڑا تھا۔ عشق کا دیوتا معاشرت کی عجیب غریب زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ پاپا نے نظریں اٹھائیں۔ غصہ کی ایک لہر ان کے رخسار کی ہڈی سے تیزی سے ابھری اور ٹھوڑی کے ذرا ادھر ختم ہو گئی۔ انہوں نے بے چینی

سے پہلو بدلا۔ صوفے کے سپرنگ کھڑکھڑا اٹھے۔ دانت پیستے ہوئے انہوں نے میری طرف سُرخ سُرخ آنکھوں سے دیکھا۔ میری گردن اور بھی لٹک گئی۔ قالین میں نظریں اور بھی گڑ گئیں۔ اور پھر فضا میں ایک گرجدار آواز اُبھری جو دانتوں کی کڑکڑاہٹ میں گڈ مڈ ہو کر رہ گئی۔

"پھر سوچ لو؟"

محبّت اور سوچ کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ جو محبّت سوچ سمجھ کر کی جاتی ہے۔ اس ملمع کی طرح ہے جسکی چمک جلد ہی ختم ہو جائے۔ میں نے سوچنا گناہ سمجھا۔ اگر آدمی نے سوچنا ہی ہو تو محبّت کرنے سے پہلے سوچے۔ محبّت کرنے کے بعد سوچنا اوچھا احمق پن ہے۔ اتنی ہی باتیں میرے ذہن میں گزری تھیں کہ میں ان کے تخاطب کا انتظار کرنے لگا۔ جب سے میں یہاں حاضر کیا گیا تھا۔ یہ ذرا ذرا سے وقفے میرے لئے سوہان روح بنے ہوئے تھے اور مجھ پر قیامتیں بپا کر رہے تھے۔ میں نے ذراسی نظریں اٹھائیں تو انہوں نے پھر پوچھا۔

"تم اسے نہیں چھوڑ سکتے؟"

میں نے آواز نکالنا چاہی۔ مگر الفاظ گلے میں اٹک گئے۔ اور پھر انہوں نے کچھ ایسے دبدبے سے مخاطب کیا کہ ساری فضا میں ہلچل سی مچ گئی۔

"بتاؤ؟"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ میں ان کو کیا بتاؤں۔ ایک دفعہ بتا تو چکا ہوں۔ بار بار پوچھنے سے فائدہ۔ خواہ مخواہ میری پریشانیوں میں اضافہ کر رہے ہیں۔ پاپا نے پھر استفہامیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میرے دونوں چچا بھی قہر آلود نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ ان

دونوں نے پاپا کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں۔ آپ سوچ کیا رہے ہیں۔ رائفل کی گیارہ گولیاں اس کے سینے میں ٹھنڈی کر دیجیے اور قالین اٹھا کر یہیں بوٹی بوٹی کر کے گڑھا کھود کر دبا دیجیے۔ آخر اس ننگِ خاندان کو نظروں کے سامنے کھڑا کیوں کر رکھا ہے۔ جس طرح اس نے ہماری ناموس فنا کی ہے۔ اسی طرح اسے بھی صفحہ ہستی سے مٹا دیجیے۔ کھڑے کھڑے میری ٹانگیں لکڑی کی طرح بے حس ہو چکی تھیں۔ میں نے پاؤں کو حرکت دینا چاہی مگر وہ تو برف کی طرح جم چکا تھا۔ میری گردن تھک کر سیدھے ہونے کی کوشش میں اور بھی جھک گئی تھی۔

پاپا نے پھر کہا

"کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟"

ابکی میں نے اپنی تمام سوئی ہوئی قوتیں مجتمع کر لی تھیں۔ میں نے نظریں اٹھائیں اور کہا:۔

"ہاں"

ان کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ انھوں نے غضب آلود نگاہوں سے مجھے دیکھا اور کہا۔

"جاؤ میرے گھر سے ابھی نکل جاؤ"

میری ٹانگوں میں جو کھڑے کھڑے اکڑ گئی تھیں یکلخت برقی لہر دوڑ گئی۔ میں نے سوچا چلو اس روح فرسا عتاب سے جان چھوٹی۔ میں نے دو قدم ہی اٹھائے تھے کہ پھر آواز گونجی۔

"ٹھہرو"

میرے قدم رُک گئے ۔ میں نے مڑ کر دیکھا ۔ پاپا کی آنکھوں میں آنسو تھے یا شاید میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا ۔ غصہ سے میرا خون کھول رہا تھا ۔ انہوں نے میری طرف دیکھا ۔

" اس گھر کی کوئی چیز تمہاری نہیں ہے ۔ یہاں سے کوئی چیز مت لے جانا ۔ اور میری زندگی میں اس گھر کی دہلیز پر پھر کبھی قدم نہ رکھنا ۔"

میں نے تمام لفظوں کو بغور سُنا ۔ ایک ایک لفظ کند چھری کی نوک سے میرے دل پر کندہ ہو گیا ۔ میں نے ان کی بات کا جواب نہیں دیا ۔ اور میرے قدم بڑھتے ہی گئے ۔ میرا غصہ انتہا کو پہنچ چکا تھا لیکن مجھے اپنی منزل معلوم نہ تھی ۔ میں کچھ تعین کیے بغیر چل پڑا ۔

میں وہ راہی تھا جسے اپنی منزل تک کا پتہ نہ تھا ۔

O•

فلک بوس عمارتیں تصویر حیراں بنی کھڑی تھیں ۔ سارے ماحول پر ایک عجیب سا پُراسرار سناٹا چھایا ہوا تھا ۔ گلی میں بوٹوں کی چرچراہٹ اس ماحول کی پُراسرار خاموشی سے برسرپیکار تھی ۔ میں کبھی کبھی کنکھیوں سے اِدھر اُدھر دیکھ لیتا تھا ۔ مجھے یہ احساس سا تھا کہ میری ناگفتہ بہ حالت پر کوئی خندہ زن نہ ہو ۔ میری پشت پر کسی کی نظریں چبھ رہی تھیں ۔ میں نے پیچھے مڑ کر ایک چھچلتی سی نگاہ دوڑائی مگر مجھے کوئی نظر نہ آیا ۔ یہ محض ایک واہمہ تھا ۔ میں چلتے چلتے سڑک پر پہنچ گیا ۔ دھول اڑاتی موٹریں ایک دوسری کا تعاقب کر رہی تھیں ۔ چلتے چلتے میں موٹروں کے اڈے پر پہنچ چکا تھا ۔ زندگی کے تفکرات کی دھول کو میں نے رومال سے چہرے پر سے صاف کیا ۔ اور سوچنے لگا میں یہاں کیا

لینے آیا ہوں۔ میرے پاس تو پھوٹی کوڑی تک نہ تھی۔ میں کف افسوس مل رہا تھا۔ میری انگلی کا سب سے حساس حصہ دوسرے ہاتھ پر جا پڑا۔ میرا رنگ فق ہو گیا۔ یہ سونے کی انگشتری تھی۔ اور میں نے اس انگشتری کو عتیق کے ہاتھ سے اتار کر اپنی انگلی میں پہن لیا تھا............اس کی تابندگی و درخشندگی میری روح کی غذا بنتی تھی میں نے ایک نظر اسے گھورا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ میں پھر سوچ میں غرق ہو گیا۔

پریت نگر یہاں سے پورا بیالیس میل تھا۔ پیدل پہنچنا بھی ناممکن تھا اور پھر میں تو بہت جلد عتیق کے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔ کیا مجھے عتیق کو کہنے کی ضرورت محسوس ہو گی کہ میں نے زندگی کی تمام مسرتیں تمہارے قدموں پر نچھاور کر دی ہیں۔ دیکھو میں تن تنہا تمہاری محبت کے سہارے جی رہا ہوں۔ میں نے پیار کی نشانی کو ایک نظر پھر دیکھا۔ اب کی میں اسے دیکھتا ہی رہا۔ کبھی پیار بھی بیچا جاتا ہے۔ پیار کو گروی رکھنا اس کے تقدس کو ختم کرنا ہے۔

گلشن آباد میں مجھے آئے ہوئے بہت عرصہ تو نہیں گزرا تھا۔ میں پریت نگر میں ہی مستقل طور پر مقیم تھا۔ بچپن لڑکپن اور پھر جوانی کی کچھ بہاریں وہیں دیکھیں۔ عتیق کا مکان میرے مکان کے ساتھ تھا۔ وہ مجھے چوری چوری روز رات کو ملنے آیا کرتی تھی..... وہ ایک بدقسمت رات تھی جب ہماری یہ خوبصورت چوریاں پکڑی گئیں... خوب تماشا ہوا۔ ہماری محبت کے پرخچے اڑے۔ ہمارے جذبات کی دھجیاں اڑا دی گئیں۔ مگر دیوانگی تھی کہ بڑھتی ہی چلی گئی۔ میں نے بی۔اے کا امتحان دیا اور ختم ہوتے ہی ممی نے مجھے گلشن آباد پاپا کے پاس بھیج دیا۔ ساتھ ہی یہ بھی تنبیہہ کر دی تھی کہ پھر کبھی پریت نگر نہ آنا اور نہ ہی اس گھر میں کبھی قدم رکھنا۔ پریت نگر اتنی دور تو نہ تھا۔ میں آگ کا دریا، اشکوں کا سمندر، آہوں کی اندھیریاں سب کو عبور کر کے منزل پر کیوں نہ کمی

طرح پہنچ ہی جاتا۔ اور اپنے مخصوص طریق سے عتیق کو اطلاع کرتا۔ مجبوریوں کی زنجیروں کو عشق کی آگ پگھلا دیتی۔ مگر ماحول کا استہزاء میری نظروں سے اوجھل نہ تھا۔ کچھ ملاقاتیں اس ماحول میں بھی ہوئیں مگر یہ سلسلہ بھی ناپائیدار نکلا۔ اور اب چھپ چھپ کر ان چوری کی ملاقاتوں کی وجہ سے ہی آخری فیصلہ ہُوا تھا۔

نئی نئی تصویریں میرے ذہن کے افق پر ابھر رہی تھیں اور میں بے حس و حرکت پتہ نہیں خلاؤں میں کیا ڈھونڈ رہا تھا کہ ایک آواز میرے کانوں میں اس طرح آئی جیسے کنوئیں سے مجھے کسی نے پکارا ہو۔ الفاظ کا مفہوم میں سمجھ نہیں سکا۔ پھر دھندلکے میں مسکراہٹ کی ایک جھلک سی دکھائی دی۔ چہرے کے خط و خال تاریکی میں ڈوب گئے تھے۔ میں نے آنکھوں سے اندھیرا دور کیا۔ یہ میرے موسیقی کے استاد تھے۔ ایک زمانہ میں مجھ سے غالبؔ کے نکتے سمجھا کرتے تھے۔ غالبؔ میرا پسندیدہ شاعر تھا۔ دنیا کی ہر شرح پڑھنے کے بعد میں اس کے ایک ایک شعر پر پورا پورا دن صرف کیا کرتا تھا۔ اور ہر شعر کے ہر پہلو کے بارے میں بے ساختہ گفتگو کر سکتا تھا۔ موسیقی کے استاد نے استفسار چاہا۔ آپ پریت نگر جا رہے ہیں؟ میں نے جانے کس خیال میں اثبات میں سر ہلا دیا۔ جب وہ دو ٹکٹ لے آیا تو مجھے اپنی رونی سی صورت کا احساس ہُوا۔ اور پھر اپنی تمام ذہنی کیفیت پر نظر گئی۔ میں نے مسکرانے کی کوشش کی مگر مسکراہٹیں کہیں دور کھو گئی تھیں۔ وہ جولی موڈ میں تھے۔ انہوں نے مجھے اپنی دنیا کی طرف کھینچنا چاہا۔ مگر میں آنسو پیئے، لب سیئے کسی مجسمہ کی طرح خاموشی کا بت بنا رہا۔ اس نے بھی میری حالت زار دیکھ کر مجھے دق کرنا مناسب نہ سمجھا۔

O

میں برلب سڑک پژمردہ کھڑا افق منزل اور شفق منزل کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ چند قدم کے فاصلے پر افق منزل کھڑی تھی۔ جہاں میں نے بچپن، لڑکپن اور جوانی کے تازہ اور شگفتہ دن گزارے تھے۔ اب میں اسی افق منزل کو سہمے سہمے انداز سے ڈرتے ڈرتے چوری چوری خوفزدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ساتھ ہی شفق منزل جلوہ افروز تھی۔ اس کا نقشہ میرے دل کی گہرائیوں میں نقش تھا۔ میں اس کی ایک ایک اینٹ سے واقف تھا۔ اس کی بنیادوں کی وسعت اور عمق تک سے پوری طرح آشنا تھا۔ مگر اب چند قدم آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ اسی شفق منزل میں اسی سنہرے محل میں عتیق قید تھی۔ وہ عتیق جسکی وجہ سے میں شہر بدر کر دیا گیا تھا۔ اور افق منزل سے نکال کر مجھے گلشن آباد میں آکاش منزل میں محبوس کر دیا گیا تھا۔

چھوٹی گلی سے ایک بچہ اچھلتا کودتا باہر نکلا۔ یہ میرا چھوٹا بھائی تھا۔ میں اسے دیکھ کر کھسک گیا۔ میں اسے پیار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ میرے تمام رشتے میرے پاپا نے ایک ہی فیصلہ سے منقطع کر دیئے تھے۔ میں آگے کدھر جا رہا تھا۔ مجھے خود بھی تو علم نہیں تھا۔ کٹی ہوئی پتنگ۔ کون جانے کہاں جا گرے۔

میں بُوا کے گھر جا پہنچا۔ بُوا مجھے پہچانتی نہیں تھی میں نے بھی اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ اگر پہلے کبھی دیکھا ہو گا تو اس وقت ذہن میں کچھ نہیں تھا۔ میں سوچ رہا تھا میں اسے کیا کہوں گا، کیسے بات شروع کروں گا؟ اسے کس طرح مناؤں گا؟ بُوا میرا منہ تک رہی تھی۔ میں اپنے ہی خیالوں میں کھویا ہُوا بولتا رہا۔ " بُوا جی آپ مجھے نہیں جانتیں؟ میں دیپک ہوں۔ میری قسمت میں جلنا ہی جلنا ہے۔ میں نئی اُمید کی طرح چمکتا ہوں۔ اور مایوسی کی طرح بجھ جاتا ہوں۔ مجھے آپ کے سہارے کی ضرورت

ہے۔ اگر آپ مجھے سہارا نہ دیں گی تو میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بجھ جاؤں گا۔ آپ عورت ہیں۔ اور عورت کا دل پارس ہوتا ہے۔ جس پتھر کو چھو لے وہی سونا بن جاتا ہے۔ کیا آپ چاہیں گی کہ میں ابد تک ہی پتھر بنا رہوں؟"

بوا کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ وہ خود زندگی کے سمندر میں بے سہارا طغیانیوں پر بہتا ہوا تنکا تھی۔ اس میں اتنی سکت ہی کہاں تھی کہ وہ کسی کو سہارا دے سکے۔ اس کی آنکھوں میں ماضی تیر رہا تھا۔ میں نے اپنی التجا کے ایک ایک لفظ کو دوبارہ دہرانا شروع کیا:۔

"بوا جی آپ مجھے نہیں جانتیں؟ میں دیپک ہوں! میری قسمت میں جلنا ہی جلنا ہے۔ میں نئی امید کی طرح چمکتا ہوں۔ اور مایوسی کی طرح بجھ جاتا ہوں۔ مجھے آپ کے سہارے کی ضرورت ہے۔ اگر آپ مجھے سہارا نہ دیں گی تو میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بجھ جاؤں گا۔ آپ عورت ہیں اور عورت کا دل پارس ہوتا ہے۔ جس پتھر کو چھو لے وہی سونا بن جاتا ہے۔ کیا آپ چاہیں گی کہ میں ابد تک پتھر ہی بنا رہوں۔"

یہ الفاظ دہراتے ہوئے میری جامد و ساکت آنکھوں میں آنسو تیر آئے تھے۔ لیکن میں انہیں گرنے نہیں دینا چاہتا تھا۔ یہ کسی کی محبت کے مقدس انمول موتی تھے۔ ان کی چمک محبت کی رفعت کی طرح کبھی نہ ختم ہونیوالی تھی۔

بوا بہت اچھی عورت تھی۔ میرا جی چاہتا تھا بوا کو اتنے بڑے کام کے صلہ میں بہت کچھ دوں۔ مگر میرے پاس تو آنسوؤں اور جذبات کی روانی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ میں نے سوچا کیا بوا سے ادھار کر لوں؟ ایسے معاملے میں ادھار کی گنجائش

ہی کہاں ہوتی ہے۔

تو ساری بات کو جان گئی تھی۔ تو میرے منجھلے بھائی کی پیدائش کے وقت ممی کے پاس آیا کرتی تھی۔ اس کی سمجھ میں سارا معاملہ آگیا تھا۔ اس نے مجھے ایک نظر پیار سے دیکھا اور وہ عتیق کو بلانے چلی گئی۔ میرے پاس اسے دینے کے لیے تھا ہی کیا۔ میں جذبات کی طغیانیوں میں ڈوب گیا۔ میری نظر ہر بار انگشتری پر آکر رُک جاتی تھی۔ لیکن جب تک میری آخری سانس تک باقی تھی یہ انگشتری مجھ سے جُدا نہیں ہو سکتی تھی۔ مجھے یہ احساس تھا کہ اگر میں نے اس سے پہلے ایسا کیا تو شاید اسی وقت میرا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ پھر؟ پھر؟ پھر؟ پھر؟

علاج چیست؟ جواب ندارد۔ اور میرا ذہن عتیق کی طرف منتقل ہو گیا۔ ابھی عتیق آئے گی۔ مجھے دیکھ کر کتنا خوش ہوگی۔ بے پناہ وہ بلیوں اُچھلے گی۔ اور میری کیا کیفیت ہوگی؟ میں اسے گلے سے لگا کر اپنی تمام بپتا کہہ سناؤں گا۔ وہ میرے آنسوؤں کو اپنے ریشمی آنچل کے پردوں میں چھپا لے گی۔ اور پھر انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لے گی۔ میری اس پاکیزہ امانت کو وہ اپنی چھاتی سے چمٹائے چمٹائے پھرے گی۔

میں انتظار کی گھڑیاں گن گن گزار رہا تھا۔ تو ابھی نہ چکی تھی۔ جانے کس دلدل میں پھنس گئی تھی۔ میں دہریہ قسم کا آدمی بن گیا تھا۔ پے بہ پے چرکوں نے مجھے ایسا بنا دیا تھا۔ لامذہبیت۔ یہ چیز میرے سراپا میں کوٹ کوٹ کر بھر گئی تھی۔ مگر اس وقت مجھے خدا یاد آرہا تھا اور میں نے نہایت عجز و انکسار سے رو رو کر التجائیں کر کر کے دعا مانگی تھی۔ کہ اے خدا تو ہی عظیم و برتر ہے۔ تو ایک

دفعہ عتیق کو صرف چند لمحوں کے لیے ملا دے اور یہ اب صرف تیرے ہی بس میں ہے۔ میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں پھر کبھی تجھ سے پوری زندگی کچھ نہیں مانگوں گا۔ یہی میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو ہے اور صرف تو ہی اسے پورا کر سکتا ہے۔ اس ملاقات پر ہم نے زندگی کا پروگرام بنانا تھا۔ آج اس کا مجھ سے ملنا بے حد ضروری تھا۔ تُوا کو گئے ہوئے کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ مجھے یہ خوف اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا کہ کہیں عتیق کو کوئی گمراہ نہ کر دے۔ وہ گمراہ ہو گئی تو میں مایوسیوں کے کھنڈرات میں ہمیشہ کے لیے دفن ہو جاؤں گا۔ میں نے کھڑکی کے پٹ سے جھانکا، دُور سے مجھے ایک سایہ سا اپنی طرف آتا دکھائی دینے لگا تھا۔ میں بار بار بڑی بے چینی سے اس کی طرف دیکھتا، سایہ اکیلا تھا۔ خدا خیر کرے میرے دل کی دھڑکن کچھ تیز ہونے لگی تھی۔ میرے پژمردہ چہرے پر مایوسی اور گھبراہٹ کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ میں ڈر سا گیا۔ اب تُوا قریب اور قریب آ رہی تھی۔ میرا دل ڈوب رہا تھا۔ میرا حلق خشک ہو گیا۔ تُوا کی آواز بڑی دور سے میرے کانوں میں آ رہی تھی۔

"اس کی ماں سائے کی طرح اس سے چمٹی ہوئی ہے۔ ذرا دیر کو بھی تو اس سے علیحدہ نہیں ہوتی۔ اتنے سارے وقت میں چند لمحے تنہائی کے نصیب ہوئے۔ وہ کہتی ہے۔ میں کیسے آ سکتی ہوں۔ میں آگ کے دریا میں بے سہارا جل رہی ہوں۔"

میری پیاس بڑھ گئی تھی۔ آنسو پلکوں سے جھانک رہے تھے۔ میں ان آنسوؤں کو پینے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔

"زندگی شاید آنسوؤں ہی کی کسی لڑی کا نام ہے۔"

○

شام کی تاریکی بڑی اداس تھی!

غم روزگار بلائے ناگہانی کی طرح میرے احساسات پر مسلّط تھا!!

دیو قامت، کسی اژدہا کی طرح منہ پھیلائے سیاہ رات برق رفتاری سے میری طرف بڑھ رہی تھی!!

بھوک نے میرا بُرا حال کر رکھا تھا۔ سر چھپانے کو کوئی جگہ نہ تھی۔ میں تو پہلے ہی آبلہ تھا۔ اس طویل سفر میں راہیں بھی ملیں تو ویران اور پُر خار۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ دماغ بالکل ماؤف ہو گیا۔ میں نے سوچنا چاہا مگر کچھ سوجھ ہی نہ رہا تھا۔ بغیر ارادہ کے نامعلوم منزل کی طرف قدم بڑھتے رہے۔ سوچوں میں غلطاں میں چلتا رہا اور سوچتا رہا۔ مجھے اب کدھر جانا چاہیئے۔ مجھے کچھ بھی تو نہ سوجھ رہا تھا۔ اچانک ایک ستارہ چمکا۔

خودکشی؟

اور پھر ایک لمحہ سے پہلے یہ ستارہ بجھ گیا۔ میں بغیر کچھ سوچے اور آگے چلتا رہا۔ بجھی ہوئی چنگاری ایک مرتبہ پھر چمکی۔ زندگی سے فرار۔ میں اسٹیشن سے بہت دور نکل گیا تھا۔ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ سانولی بوڑھی سڑک بھی زمانے کی دھوپ چھاؤں دیکھ دیکھ تھک کر سو گئی تھی۔ کبھی کبھی کوئی ٹرک رات کے مہیب سناٹے کو توڑتا ہوا اس کے مضمحل اعضا کے پُرخچے اڑاتا گزر جاتا تھا۔ میں ریلوے لائن کے ساتھ اُگی ہوئی جھاڑیوں میں چھپا بیٹھا تھا۔ کسی ٹرک کی کھڑکھڑاہٹ سننے کے بعد اس کی خونخوار درندے کی آنکھوں ایسی روشنی دیکھ کر میں گردن نیچے کر کے اور بھی دبک جاتا۔ آج میں اس جہاں سے رخصت ہونے پر تلا ہوا تھا اور بڑی بے تابی

سے گاڑی کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔ اس انتظار میں رہ رہ کر عتیق یاد آرہی تھی۔ ابھی ابھی میرے غموں بھرے سینے سے گاڑی گزرنے والی تھی۔ میں نے سوچا اس کے بعد غم واندوہ کا یہ طوفان تھم جائے گا۔ اس پر سکون خیال کے ساتھ ایک لمحہ کے لیے مسرت نصیب ہوئی۔ میری نعش اسقدر مسخ ہو جائے گی کہ اسے کوئی پہچان تک نہ سکے گا۔

"لیکن عتیق کا کیا ہو گا؟"

عتیق کیا کہے گی؟ نہیں نہیں میں اسے کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ اس کے بغیر تو موت بھی بے معنی ہے۔ میں نے گاڑی کی طرف دیکھا۔ وہ آ ہی نہیں رہی تھی اور میرے ارادے متزلزل ہو رہے تھے۔ میں تذبذب میں پڑا بیٹھا دبکا رہا۔ آخر گاڑی جیت گئی اور میں ہار کر پھر اسی ویرانے کی طرف چلنے لگا۔

شب دیجور کی سیاہ زلفیں دور دور تک چھال چھائے بکھری پڑی تھیں۔ میں موت کی وادیوں میں تنہا گھوم رہا تھا۔ مجھے کسی سہارے کی ضرورت تھی اور سہارے سے بھی پہلے مجھے سر چھپانے کو جگہ چاہیئے تھی۔ میرا ایک دوست، دوست بھی نہیں کہنا چاہیئے۔ لفظ واقف زیادہ موزوں رہے گا۔ یہاں سے تین چار میل دور رہتا تھا۔ یہ چار کاکوس کیسے طے ہوں گے؟ مجھے تو بلا کی بھوک لگی تھی۔ جسم میں سکت تک نہ رہی تھی۔ مجھے نٹ ہیمسن کی ناول بھوک یاد آگئی۔ اس ناول کو پڑھتے وقت میں نے سوچا تھا ہیرو کی بھوک کی انتہا ہے۔ مگر اب میری حالت بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی۔

میں پریشانیوں کے صحرا کو عبور کرتا رہا۔ آخر اس کمرے تک پہنچا جسے میں نے

ایک دفعہ بیکاری کی حالت میں دیکھا تھا۔ یہیں میرا واقف یا دوست رہا کرتا تھا۔ میرا خیال تھا یہ اب بھی اسی حالت میں ہوگا اپنے مکیس کی رفاقت کے ساتھ۔ پتہ چلا مکین اپنی زمین پر گیا ہوا ہے۔ اس کی زمین اس جگہ سے بہت دور تھی۔ مگر مجھے میری ایا ہیچ خواہش ادھر لے ہی گئی۔ منزل تھی کہ ہر ہر قدم پر دور بھاگ رہی تھی۔ ایک موہوم سی اُمید پر میں لڑکھڑاتا چلا جا رہا تھا۔ میں فلسفۂ زندگی پر غور کرتا رہا۔ زندگی نام ہے مر مر کے جیئے جانے کا۔ وہاں پہنچا تو پتہ چلا وہ شہر چلا گیا ہے۔

اس آخری کوشش نے میری کمر ہی توڑ دی۔ میری آخری امید آنکھ جھپکنے میں راکھ ہو گئی۔ قریب تھا کہ میں لڑکھڑا کر گر جاتا۔ میں نے سنبھلنے کی کوشش کی۔ دکھوں بھری اس زندگی میں جن کے قدم ایک دفعہ اکھڑ جائیں اس کے لیے سنبھلنا اتنا آسان تو نہیں ہوتا۔

صبح ہو چکی تھی! ویرانے کی بھیانک صبح!!

دوسرا دن بھی اسی خستہ اور ویران حالت میں گزرا۔ سڑکوں پر پھر کر۔ باغوں کی روشوں پر بیٹھ کر، بھوک سے نڈھال۔ بے جان جسم لیے میں عتیق کے خیالوں میں کھویا رہا۔ شام کی روشنیاں جگمگانے لگیں۔ آج بھی میرے سامنے۔۔۔۔۔ سب سے بڑا مسئلہ رات بسر کرنے کا تھا۔ مجھے پریشانی اور بے چینی مضطرب کر رہی تھی۔ ابھی کوئی چوکیدار کوئی پہرے دار، کوئی پولیس مین آدھمکے گا۔ میں کھمبے پر چمکتی ہوئی روشنی کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہا تھا اور جیسے اس سے پوچھ رہا تھا، "تو ہی کوئی راہِ فرار بتا، اے میری ہمسفر" مگر وہ میرے ویران حال پر نہ ہنستی تھی نہ روتی تھی۔ میں پھر بے سوچے سمجھے چل پڑا۔ سڑکوں پر متعین سپاہیوں کی تلاشی

نگاہوں کا مجھے احساس تھا۔ آدھی رات کے وقت میں ایک مقبرہ کی مسجد میں لیٹا تھا۔ جوانانِ چمن خوابیدہ حالت میں آنے والے اجنبی کی اضطرابی کیفیت سے ناآشنا بے حس کھڑے تھے۔ میرے مضمحل قویٰ اونگھنے لگے تھے کہ مجھے محسوس ہوا جیسے سیاہ ناگ میرے قریب سرک رہا ہے۔ موت میرے قریب رینگ رہی تھی۔ یا شاید مجھے اپنی شفیق پناہ میں لینا چاہتی تھی۔ لیکن آج میں اس سے دوستی کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ جانے کیوں!!

اس ویرانے کو چھوڑ کر میں آبادیوں میں آگیا۔ مگر یہ صبح اجنبی سی صبح تھی۔ کائنات کی ہر شے بیگانہ سی معلوم ہو رہی تھی۔ میں سر نیوڑائے چلا جا رہا تھا۔ کوئی واقف کار ملتا تو خمیدہ سر نظر چرا کر گزر جاتا۔ احباب دیکھ کر منہ پھیر لیتے۔ دوست راستہ بدل لیتے۔ میں خود ہی کنی کترا جاتا رہا۔ میرے اور احباب کے درمیان بیگانگی کی ایک خلیج سی حائل ہو گئی تھی۔ میرا لباس چُرمُر ہو گیا تھا۔ چہرے پر اداسیاں بکھری ہوئی تھیں۔ شیو بڑھنے کی وجہ سے صورت پہ ہُونق پن برس رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا آخر کس گناہ کی پاداش میں مجھے جائیداد سے عاق کر دیا گیا ہے۔ "کیا محبت کرنا گناہ ہے۔!؟ خدا خود بھی تو محبت کرتا ہے۔ "کہیں میں مفکر تو نہیں بن رہا"۔ میں اسی ادھیڑ بُن میں تھا کہ ایک شخص نے میرا راستہ روک لیا۔ اس کی حالت شاید ہی مجھ سے کچھ بہتر ہو۔ بال بکھرے ہوئے۔ لباس کے رکھ رکھاؤ سے بے نیاز۔ چال شاعرانہ، گفتگو ایسی جیسے سرور میں ہو۔ اس نے مجھے چائے کے لیے کہا اور ہم بوسیدہ ٹین سے تعمیر شدہ ایک کینٹین میں بیٹھ گئے۔ ضرورت تمام تکلفات مٹا دیتی ہے۔ مفلسی شائستگی کے لیے مقراض ہے۔

یہ فناؔ صاحب تھے۔ شاعری سے شغف رکھتے تھے۔ تعلیم کو ادھورا چھوڑ دیا تھا اور شاعری سے ناطہ جوڑ لیا تھا۔ ایک اخبار میں بغیر تنخواہ کے سب ایڈیٹری کرتے تھے۔ شوق کا یہ عالم تھا کہ ہر لمحہ خدشہ رہتا مالک جواب نہ دیدے۔ میں نے کہا ایڈیٹر بن کر کیا کرو گے۔ " مجھے صرف شہرت چاہیے "۔ یہ دیوانہ شہرت کی تلاش میں گھات لگائے بیٹھا تھا۔ اس کا باپ بیرسٹر تھا۔ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ شاید میرا چہرہ کتاب زندگی کی تفسیر تھا۔ نہ اس نے کچھ پوچھا نہ میں نے کچھ بتایا۔ اپنا کمرہ کھول دیا۔ اس کمرے کا سامان مختصر تھا۔ اور بے ترتیب بکھرا ہوا تھا۔ مجھے تو ایسے محسوس ہوا جیسے اس کمرے کو کوٹھی کا مفلوج حصہ سمجھ کر دیس نکالا دیدیا گیا ہو۔ یا جیسے یہ اپنے رنڈاپے پہ بین کر رہا ہو۔

دو تین دن کے بعد ان کا نشہ ہرن ہوا تو انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اب میرا انہی کے ذریعے ایک ادیب سے تعارف ہوا۔ یہ بھی زندگی کی تلاش میں تھے۔ ابھی اٹھارہ بیس سال کے نوجوان تھے۔ تعلیم کو ابتدائی مرحلوں پر ہی چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ ان کا مسکن ایک نئی آبادی تھی جو ابھی زیر تعمیر تھی۔ چوکیدار کی ضعیف بیوی نے انہیں ایک کمرے میں سونے کی اجازت دے دی تھی۔ مجھے اپنا کلام بلاغت پڑھ پڑھ کر سناتے رہے۔ دو ایک رسالے بھی دکھائے جو چھپ کر بکنے کی بجائے شاید اپنی ناگفتہ بہ حالت کو لوگوں کی تیز نگاہوں سے چھپائے پھرتے تھے۔ ان کی رفاقت سے اتنا تو ہوا رات شعر و شاعری ہوتی اور دن کو میں نوکری کا جویا نیا حالات کے تند و تیز دھارے میں بے سہارا تنکے کی طرح ہچکولے کھاتا رہتا۔

○

مجھے ایک فراڈ قسم کی فرم میں چھوٹی سی نوکری مل گئی۔ اس سے پہلے جہاں بھی خاک چھانتا رہا روکھا سا جواب ملتا۔ کسی نے ازراہِ نوازش اثبات میں سر ہلا دیا تو ساتھ ہی استفسار فرمایا۔ شارٹ ہینڈ جانتے ہو؟ ٹائپ جانتے ہو؟ اور میں اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا۔ مجھے توقع نہ تھی کہ اس فرم سے تنخواہ ملے گی۔ پھر بھی ایک موہوم سی اُمید پر کام کیے جا رہا تھا۔

فرم کے نیچے ایک بیچارا میری طرح مصیبت کا مارا ہوٹل تھا بے بسی اس کے چہرے پر مسلط تھی۔ وہ اپنے مالک کا بین کیا کرتا۔ کھانا اتنا گندہ کہ دیکھتے ہی اسی وقت ابکائیاں آنے لگیں۔ میرے لیے تو یہ بھی تاج محل سے کم نہیں تھا۔ میں نے موٹی توند والے مالک سے نہایت عجز و انکسار سے فریادی لہجہ میں کہا مجھے کھانا کھلا دیا کرو۔ تنخواہ ملنے پر مہینے کا بل ادا کر دوں گا۔ اس نے مجھے تفتیشی نگاہوں سے دیکھا۔ میں نے کہا مالک فرم کی ضمانت لے لیجیے۔ اس نے مجھے یوں دیکھا کہ میں نے محسوس کیا اس کی نظریں مجھے کند چھری کی طرح ذبح کر رہی ہیں۔

مجھے معجزانہ طور پر کچھ روپے پیشگی مل گئے۔ فاقوں نے مجھ سے کنارہ کشی کر لی تھی۔ اب مجھے رہائش گاہ کی تلاش تھی۔ ایک واقف کار نے ایک بڑا سا کمرہ دلوا دیا۔ کمرہ دن کے وقت بھائیں بھائیں کرتا رہتا۔ اس کا کرایہ میری ہمت سے زیادہ تھا۔ میں نے جستجو جاری رکھی۔ ایک ہوٹل نظر پڑا۔ ہوٹل دیکھ کر صحرا کا منظر سامنے آ جاتا تھا۔ ایک تنگنائے سی تھی۔ پیچھے ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ کمرہ اور تنگنائے کے وسط میں ایک حقیر سا صحن تھا۔ یہاں سے اوپر سیڑھیاں جاتی تھیں۔ اوپر ایک کمرہ تھا جس میں ایک ڈاکٹر رہتا تھا۔ شاید وہ بھی اس بھری دنیا میں اکیلا تھا۔ میں نے

مالک سے کہا یہ کمرہ مجھے دیدو۔ کہنے لگا جب ڈاکٹر چھٹی کر جائے گا۔ آپ اس کی چارپائی پر سو جایا کریں۔ میں نے کہا۔ نچلی منزل کا کمرہ دیدو۔ کہنے لگا یہاں تو میری فیملی آکر رہا کرتی ہے۔ میں نے کہا تو پھر کونسی جگہ ہے؟ کہنے لگا رات کو کرسیاں اس کمرے سے اٹھا لیا کریں گے۔ آپ سو جایا کریں۔ دن کو میرا کاروبار چلتا رہے گا۔ آپ سامان اٹھا کر صحن میں رکھ لیا کریں۔ کرایہ تیس روپے۔ ہوٹلوں میں چار روپے یومیہ سے کم کمرہ بھلا کیا ملے گا۔ میں نے حسرت بھری نگاہوں سے اس تنگنائے کو دیکھا اور چل دیا۔

میرے پہلے مالک نے مجھے بے سرو سامانی کی حالت میں دیکھا تو اس نے مجھے ایک چھوٹی سی گیلری نما جگہ دیدی۔ وہ مستطیل کی شکل کی تھی اور اسکی چھت اتنی نیچی تھی کہ میرے سر کے بال اس کو چھو لیتے تھے۔ میں نے کسی طرح ایک چارپائی خرید کر اس میں ڈال لی۔

○

غمِ دوراں سے کچھ نجات ملی تو غمِ جاناں نے آن ستایا۔ زمانے کے بے رحم ہاتھوں نے میرے جذبات کو کچل دیا تھا۔ اتنے دن میں عتیق کے متعلق سوچ بھی نہ سکا تھا۔ آج عتیق بری طرح یاد آرہی تھی۔ میں اپنی بیوہ کوٹھڑی میں لیٹا عتیق کو ملنے کے منصوبے بنانے لگا۔ میری بے چارگی پر میری کوٹھڑی آٹھ آٹھ آنسو رو رہی تھی۔

میں غم کی آگ میں سُلگ رہا تھا۔ عتیق میری زندگی کی روح، میری سانسوں کی خوشبو، میرے ذہن کا عرش، میرے تخیل کی قوس و قزح، میرے دل کا سوز،

میری محبت کی تڑپ، اور میرے خیالات کی تتلی تھی۔ عتیق کے حسن کی سنہری آبشار میرے دل پر گر رہی تھی۔ اس کے سنہرے لانبے گیسو میرے دل کا چلمن تھے۔ اس کے رخساروں کی تازگی میری آنکھوں کی چاندنی تھی۔ اس کا میانہ قد اور اٹھارہ کا سن، اس پر قیامت ڈھاتا تھا۔ آنکھیں شربتی، زلفیں سنہری، جسم سورج کی پہلی کرن سا دلنشیں، حسن میں تازگی، مانگ سیدھی، لباس سر سراتا ہوا، طبیعت میں سادگی اور ناز و غمزہ سے بے نیاز مگر دل میں ہلکی ہلکی آنچ۔ رات کے سناٹوں میں وہ چھوٹی سی کنکر میرے صحن میں گراتی اور میں دبے پاؤں اٹھ کر آہستہ سے کنڈی کھول دیتا۔ وہ میرے بازوؤں کا سہارا لیکر جھوم جاتی۔ اور میرے بدن میں بجلیاں تڑپنے لگتیں۔

مجھے تنخواہ مل چکی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ پوری کی پوری تنخواہ بُوا کی نذر کر دوں۔ وہی مجھے عتیق سے ملا سکتی تھی۔ اس کے علاوہ دنیا کی تمام راہیں مسدود ہو چکی تھیں۔ یہی ایک چور دروازہ تھا۔ لیکن ہوٹل کا بل؟ مکان کا کرایہ؟ دونوں شقیں ایسی تھیں کہ ذرا سی دیر میں مکان خالی کروا سکتی تھیں۔ فاقوں تک نوبت آ سکتی تھی۔ مگر محبت کے بچارے اتنے دور اندیش کہاں ہوتے ہیں۔ میں پھر بھی بُوا کے پاس چلا گیا۔ فروٹ اور مٹھائی کا نذرانہ اس کے قدموں میں رکھ دیا۔ نوٹ اس کی جھولی میں ایسی عقیدت کے ساتھ رکھے جیسے میں بھکاری ہوں اور خود سراپا عجز و انکسار بن کر بڑے رقت آمیز لہجے میں جذبات سے بھرپور التجا کی۔ ”بُوا جی صرف ایک بار میں آئندہ کبھی آپ کو تکلیف نہیں دوں گا۔ میری قسمت میں موت کی اندھی شام ہے یا زندگی کی پُر نور صبح۔ آج یہ فیصلہ ہو جانے دیجئے۔ میں آپ کا احسان کبھی نہیں، تا زندگی نہیں بھولونگا۔“ بُوا نے میری آنکھوں میں آنسو تیرتے

ہوئے دیکھے تو وہ پگڈنڈی پر چل پڑی، شاید اس کا دل بھی میری حالت زار پر پسیج گیا تھا۔ اور میں حدِ نگاہ تک اس کی طرف دیکھتا رہا۔

میں خیالات میں کھویا ہوا اپنی زندگی کا رنگ محل تیار کرتا رہا۔ میرے تخیل میں زنگار رنگ تتلیاں پرواز کر رہی تھیں۔ میرا دل جامِ جم بنا تھا اور میں اس میں عتیق کا عکس دیکھ رہا تھا۔ میری آنکھوں کی شبنم اس نے اپنے رنگین آنچل میں جذب کر لی تھی۔ اس نے اپنا سر میرے دھڑکتے دل کے ساتھ لگا دیا تھا۔ پھول کی مسکراہٹ نے غمِ دل کو دھو ڈالا تھا۔ میری زندگی کی خزاں میں بے شمار ان کھلی کلیاں چٹخ چٹخ کر مسکراتے پھول بن گئیں تھیں۔

عتیق کا ایک ہی لفظ میرے زخموں کی مرہم بن سکتا تھا۔ میری حسرتوں کا مداوا، میری خواہشوں کا تریاق، میری زندگی کی روشنی، میرے دل کی بہار، میری روح کا پیار، صرف ایک لفظ، عتیق کے پھول کی پتیوں ایسے ہونٹوں سے نکلا ہوا ایک مترنم لفظ۔ دور سے لُوا اور عتیق آتی ہوئی دکھائی دیں۔ محبت کے پجاری نے میرے دل کے سمندر میں ہلکی ہلکی خوشی کی سریلی گھنٹیاں بجانی شروع کر دیں۔ مجھ پر مسرتوں کی پھوار شبنم کی طرح گرنے لگی۔ میرا رنگ شفق گوں ہو گیا۔ میری زندگی کا ویرانہ بہاروں کا مسکن بننے والا تھا۔ ابھی اس صنم کدہ میں راگنیاں چھڑ جائیں گی۔ میرے احساسات کی جل پریوں کی رفعتوں کی معراج تھی۔ معاشرے کی چٹان کو محبت کے فلک بوس شعلوں نے سیال مادے کی طرح پگھلا دیا تھا۔ میں نے زمانے کی ہر شے ہار کر زندگی کو جیت لیا تھا۔ زندگی جو عتیق کی محبت سے بھرپور تھی۔ کیسی خوبصورت ہوگی وہ زندگی، عتیق میرے قریب آ رہی تھی۔ بہت ہی قریب۔ جب اس نے دروازے میں قدم

رکھا میرے دل کے ساز ایکدم چھن چھن بج اٹھے۔

ہم دونوں اس طرح گلے ملے جیسے یہ وصال ابدی ہو۔ دل زور زور سے دھڑک رہے تھے اور امنگوں کی شمعیں جگمگ جگمگ کر رہی تھیں۔ فرطِ مسرت سے ہم دونوں ایک لفظ بھی تو منہ سے ادا نہ کر سکے۔ بوا ہمیں تنہا چھوڑ کر کب کی جا چکی تھی۔ میں شدتِ جذبات کی وجہ سے کانپ رہا تھا۔ لہجے میں تھرتھراہٹ تھی۔ عتیق کی نظریں زمین پر بچھی ہوئی تھیں۔ میں نے ٹھاٹھیں مارتے جذبات کے دھارے کی روانی کے آگے بند لگانے کی کوشش کی۔ میری گرفت کچھ ڈھیلی ہو گئی۔ میں نے گھمبیر سی آواز میں کہا۔

"عتیق ابھی کتنے امتحان باقی ہیں؟"

"امتحان؟" اس نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ پھر وہ کہیں کھو گئی۔

"ان تپتے صحراؤں میں مجھے کب تک صحرانوردی کرنا ہو گی؟"

"میں بے بس ہوں" اس نے زار زار رونا شروع کر دیا۔

میں تو پہلے ہی اپنے زخموں کی تاب نہ لانے کی وجہ سے مضطرب تھا۔ اس کے زخموں پر بھی مجھے ہی مرہم رکھنا پڑا۔ میں نے اسے سینے سے لگا کر رومال سے اس کے آنسو پونچھ ڈالے۔ مگر یہ چشمہ خشک ہونے ہی میں نہیں آتا تھا۔

"میں تمہیں لینے آیا ہوں عتیق! اپنے آنسو پونچھ ڈالو"

بڑی دیر کے بعد اس کے آنسو کچھ رکے۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ پھر ابھری، پھر ڈوب گئی۔ پھر میری طرف دیکھا۔ پھر نظریں جھکا لیں۔ اور ایک ہچکی کے ساتھ کہا۔

"بس"

میری روح لرز اٹھی۔ "بس کیا؟" میں نے محسوس کیا میرا رنگ زرد پڑ گیا ہے۔

"بس اب ختم!"

اور میرا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ کانوں کی لوئیں تپنے لگیں۔ ذہن ماؤف ہو گیا جیسے سکتہ ہو گیا ہو۔ کچھ دیر کے بعد میں ذرا سا سنبھلا۔

"ہمیشہ کے لیے؟"

"ہاں" وہ زمین میں گڑھی جا رہی تھی۔

میرے دل کا آتش فشاں پھٹ پڑا۔ ہر طرف دھواں ہی دھواں اور آگ کے شعلے تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنی آنکھوں سے اندھیرا دور کیا۔

"میں خودکشی کر لوں گا۔"

"میں بدنام ہو جاؤں گی"

"یہ بات تو تمہیں محبت کرنے سے پہلے سوچنا چاہیے۔"

"امی میری شادی کہیں اور کرنا چاہتی ہیں۔"

"تم نے امی سے پوچھ کر محبت کرنا تھی" میرے لہجہ میں بے حد تلخی تھی۔

"تمہیں معلوم ہے میں نے تمہارے لیے زندگی کی ہر خوشی قربان کر دی ہے۔ ہر نعمت سے محروم ہو گیا ہوں۔ میرا ہر عزیز مجھ سے چھُٹ چکا ہے۔ تمہاری محبت نے میرے اور والدین کے درمیان نفرت کی ایک بہت بڑی خلیج حائل کر دی ہے۔"

شدت دکھ کی وجہ سے جانے میں کیا کیا کچھ کہہ گیا۔

"میں بے بہرہ تو نہیں ہوں۔ ہر بات سے آگاہ ہوں۔"

"اسی لیے جواب دے رہی ہو۔ جواب ہی دینا تھا تو پہلے ہی دیدیا ہوتا۔ آج اس قدر در بدر ہونے سے تو بچ جاتا۔"

"میں مجبور ہوں۔"

"تمہیں اپنی مجبوریوں کا پہلے خیال ہونا چاہیے تھا۔ تمہیں کیا حق پہنچتا تھا کہ تم مجھے یوں برباد کردو کہ دنیا میں میرا نشان تک نہ رہے۔ اور خود سکون سے کنارہ کش ہو جاؤ۔"

اس نے پھر رونا شروع کر دیا۔ میرے غصہ نے کروٹ بدلی اب وہ دھیما پڑ رہا تھا۔

"عتیق مت رو۔ کم از کم میرے سامنے مت رو، یہ تو میرا نصیب ہے۔ میں تمہارے حصہ کا بھی خود ہی رو لونگا۔"

میں اسے چپ کراتا رہا۔

"کیا تم ایک مرتبہ پھر اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کر سکتی ہو؟"

"میں مجبور ہوں" اس نے ایک لمبی آہ بھری۔ اور اٹھنے لگی۔

"صرف ایک دفعہ اور مجھے مل سکتی ہو؟"

"کیسے مل سکتی ہوں؟"

"جیسے اب ملی ہو!!"

"بہت مشکل ہے۔"

"اچھا۔ الوداع۔ خدا کرے تم ہمیشہ خوش رہو۔" یہ کہتے کہتے میری چیخ

نکل گئی۔

"آپ کو کیا پتہ میرے ساتھ کیا گزری ہے۔" اس نے روتی سی آواز میں کہا اور چل دی۔

رنج و غم کا سمندر میرے اندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ آج یہ آتش فشاں پھٹ پڑا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا ابھی میری کھوپڑی کے دس ہزار ٹکڑے ہو جائینگے۔ میرے ذہن کے پرخچے اڑ جائیں گے۔ ایک لمحہ کے لیے مجھے ہلکا سا خیال آیا کہ شاید پھر ملاقات ہو سکے۔ جو کچھ وہ کہہ گئی ہے یہ سب اس کے اپنے الفاظ نہیں تھے۔ اگرچہ اس نے اظہار یہی کیا تھا۔ کہ وہ خود کہہ رہی ہے۔ لیکن مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ تو کسی کے یاد کرائے ہوئے ہیں۔ پھر دوسرے ہی لمحہ میں نے اس خیال کو ذہن سے نکال دیا۔ اور ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ آج میں نا امید ہو گیا تھا۔ جس امید پر میں ہر دکھ کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتا آ رہا تھا۔ آج وہ ہی ختم ہو چکی تھی۔ پھر میرا جینا کس کام کا تھا۔ آخر میں کس کے لیے جیتا۔ جینے میں رکھا ہی کیا تھا؟ کیوں نہ میں ابھی ختم ہو جاؤں؟ اور اس خیال سے میں زہر حاصل کرنے کی تگ و دو کرنے لگا۔

بڑی جد و جہد کے بعد میں اپنے بچپن کے ایک دوست کے پاس پہنچا۔ یہ اب ڈاکٹر بن چکا تھا۔ میں کئی طرح کے جال بچھانے کے بعد حرفِ مدعا زبان تک لایا۔ کہنے لگا کیا کرو گے؟" عیاشی کے لیے چاہیئے؟" میں نے کہا "ہاں" اس کے پاس گولیاں تھیں نہیں کہنے لگا منگوا دوں گا۔ میں نے کہا نہیں تم لکھ دو میں کسی میڈیکل سٹور سے لے لونگا۔ اس نے کچھ سوچا اور پھر خاموشی سے لکھ دیا۔ اس کے بعد تاکید کرنے لگا۔ "دیکھنا کہیں زیادہ نہ کھا جانا" یہ زہر ہوتا ہے۔ تین چار گولیاں کھانے سے موت

واقع ہو سکتی ہے۔" میں نے کہا مجھے بچہ سمجھتے ہو؟ بڑے وہمی ہو گئے ہو۔ اس کو کچھ کچھ یقین آنے لگا تو میں نے کہا ایک ٹیوب لکھ دو۔ وقت بے وقت کام آتی رہے گی۔ اور اُس نے ایک ٹیوب لکھ دی۔

ٹیوب میرے سامنے پڑی تھی۔ یہ باریک سی شیشی تھی جس میں موت کی بھیانک روح چھپی تھی۔ اسمیں چھوٹی چھوٹی سفید سفید بیس گولیاں تھیں۔ ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق یہ گولیاں پانچ آدمی موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے کافی تھیں۔ میں نے ایک بھرپور نظر اس پر ڈالی۔ میرے ذہن کے پردہ پر عتیق کی محبت کا فلم چل رہا تھا۔ عتیق بھی تو ہر عام لڑکی کی طرح دغا دشمن نکلی تھی۔ وہ تو کہا کرتی تھی "میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جو بے وفا ہوتی ہیں" لیکن وہ بھی آخر بے وفا ہی نکلی۔ مجھے اپنی محبت پر کس قدر یقین دلایا کرتی تھی۔ جب میں اپنے دوستوں کے ساتھ بیتے ہوئے واقعات اسے سناتا تو وہ کتنا جذباتی ہو کر کہتی تھی "میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں" میرا دل شق ہو گیا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا عتیق تو انہی لڑکیوں میں سے نکلی۔ میں اسے عام لڑکیوں سے مختلف بن کر دکھاتا ہوں۔ اور میں نے شیشی کا ڈھکنا کھولا۔ اسے ایک نظر دیکھا۔ ایک لمحہ کے لیے جیسے میں کانپ گیا۔ پھر میں نے ایک عجیب سے کرب کے ساتھ سب کی سب گولیاں اپنی ہتھیلی پر ڈال لیں۔ میں نے محسوس کیا میرا چہرہ سرخ ہو رہا ہے۔ آج میں اپنے مصائب کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دینا چاہتا تھا۔ میں نے ایک ایک گولی اٹھا کر جلد جلد نگلنا شروع کر دی۔ اور پھر آنکھ جھپکنے میں سب کی سب گولیاں نگل گیا۔ تاکہ بچنے کا کوئی امکان ہی نہ رہے۔

○

مارفیا کی خالی ٹیوب ڈاکٹر کے ہاتھ میں تھی۔ ڈاکٹر بہت پریشان نظر آرہا تھا۔ میرے دوست فنا صاحب میری چارپائی پر بیٹھے متلاشی نگاہوں سے ڈاکٹر کو گھور رہے تھے۔ ڈاکٹر دوایک قے مجھے کرا چکا تھا۔ میرے استغراغ کے بعد بھی ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ جلد جلد بہت کچھ سوچ رہا ہے۔ مجھے ذرا ہوش آیا تو میں بھی سوچنے کی کوشش کرنے لگا۔ پہلے تو میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ پھر آہستہ آہستہ مجھے کچھ کچھ یاد آنے لگا۔ میں نے ان دونوں کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھا۔ شدتِ درد میری برداشت سے باہر تھا۔ میں نے ڈاکٹر سے التجا کی ڈاکٹر مجھے بہت تکلیف ہے۔ فنا نے کھا جانے والی نظروں سے مجھے دیکھا اور نفرت کے لہجہ میں جس کی تہہ کے نیچے محبت چھپی ہوئی تھی کہنے لگا۔ "ایک شیشی اور زہر کی کھا لو۔ منگوا دوں" میں نے شرم سے نظریں جھکا لیں۔ اس نے مجھے بتایا اگر وہ اچانک ملنے نہ آیا ہوتا تو اب تک میرا جسم پتھر بن چکا ہوتا۔ اس زہر کی تاثیر یہ ہے کہ زہر کھاتے ہی انسان پتھر کی طرح خاموش اور ویران ہو جاتا ہے۔

فنا نے مجھے بتایا جب وہ آیا تو میں اونگھ رہا تھا۔ اس نے مجھے بیہوشی میں بڑبڑاتے دیکھا تو فوراً ڈاکٹر سے مدد طلب کی۔ اور ڈاکٹر کی کیفیت یہ تھی کہ وہ ابھی تک سہما کھڑا تھا۔ اور عجیب عجیب نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔

فنا باقاعدگی سے میرے پاس آتا رہا اور دانت پیس پیس کر وعظ کیا کرتا۔ جیسے جیسے میری حالت بہتر ہوتی رہی اس کے الفاظ میں تلخی بڑھتی رہی۔ شروع شروع میں تو مجھے یہ بری لگتی تھی۔ مگر اب اگر وہ اسی تلخ لہجہ سے گفتگو نہ کرتا تو مجھے کچھ مزا نہ آتا۔ آج اس نے آتے ہی تقریر جھاڑ دی۔ "تم تو نرے چغد نکلے۔ کچی گولیاں کھیلے ہو۔ عجیب بانگڑو

قسم کے نوجوان ہو۔ یہ میں نے غلط کہا۔ ابھی تم نوجوان نہیں ہو۔ بلیس سالہ کچے ذہن کے لڑکے ہو۔ اس عمر میں بچپن زیادہ ہوتا ہے شعور کم۔ جب آدمی پچیس تیس سال کا ہو جاتا ہے تو پھر اس کے کردار میں ٹھہراؤ آ جاتا ہے۔ وہ جذبات سے پُر الفاظ تو ادا کرتا ہے مگر ان کے ساتھ خود نہیں بہہ جاتا۔ وہ محبت کرتا ہے مگر کچا گھڑا دیکھ کر پکنے کی امید پر پروگرام ملتوی کر دیتا ہے۔ سمجھ رہے ہو نا بانگڑو۔ اسے برات سے پہلے حنا کو بھگا لانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ صحراؤں میں بھٹکتا نہیں پھرتا۔ وہ عشق کی حدیں متعین کر لیتا ہے۔ عشق کا کیا ہے۔ شاعر ایک شعر کہہ کر عشق کر لیتا ہے۔ مثلاً میں ایک ہی شعر سے ایک لڑکی رام کر سکتا ہوں۔" میرے لبوں سے مسکراہٹ پھوٹ پڑی۔

"تو اس حساب سے تم ایک غزل کہہ کر سات آٹھ لڑکیوں سے عشق کر لیتے ہو گے؟"

"بالکل اور انہیں پتہ تک نہیں چلتا۔ اظہار محبت کے لیے بہروپیا بننا پڑتا ہے۔ میری جان۔ عاشق کو ایک اچھا ایکٹر بھی ہونا چاہیے۔ ورنہ اس کا تختہ ہو جاتا ہے۔"

تحت الثرا سے ایک طرف اور آسمان سے دوسری طرف تک جو غم و اندوہ کی سیاہ بدلیاں چھائی رہتی تھیں۔ وہ فنا کی عجیب و غریب منطق سے آہستہ آہستہ چھٹ گئیں۔ فنا ہر روز ایک نئی تقریر کرتا جس کو میں سن سن کر مسکرایا کرتا۔ کبھی کبھی وہ حقائق کو بے نقاب کرنا شروع کر دیتا اور میں بے حد سنجیدہ ہو جاتا۔ وہ کہتا جس کے لیے تم اب تک مر گئے ہوتے۔ اس نے تمہاری صورت بھی نہ دیکھنا تھی۔ اور آج کسی کو یاد بھی نہ ہوتا کہ ایک گدھا مر گیا تھا۔ دنیا کو اتنی فرصت ہی کہاں ہے کہ وہ کسی کے متعلق سوچے۔ تمہارے جیسے بیوقوف روز مرتے رہتے ہیں۔ لڑکیاں شادی کر کے خوشی کے جھولے جھولتی ہیں۔ ان کو یاد بھی نہیں ہوتا کہ کسی نے ہماری

وجہ سے جان دے دی تھی۔" اور واقعی مجھے عورتوں سے نفرت سی ہونے لگی۔ یہاں تک کہ میری جمالیاتی حس تک ختم ہو گئی۔ کوئی خوبصورت سے خوبصورت عورت میرے قریب سے گزرتی تو میں کنی کترا لیتا۔ کبھی کوئی میری نظر کی زد میں اچانک آ جاتی تو نظریں جھکا لیتا۔ میں نے عورت کو قطعی اپنے ذہن سے الگ کر دیا تھا۔ مجھے اپنی حماقت پر بڑا افسوس ہوا کرتا اور میں نے اب تہیہ کر لیا تھا کہ اب کبھی عشق کے چکر میں نہیں پڑوں گا یہ پاگل پن کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

اس واقعہ سے یہ ضرور ہوا کہ میری زندگی بڑی غیر دلچسپ سی ہو گئی۔ حالانکہ اب مجھے ایک غیر ملکی فرم میں اسسٹنٹ منیجر کی جگہ مل گئی تھی۔ تنخواہ معقول تھی میرا معیار زندگی بہت بہتر ہو چکا تھا۔ مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا کہ بعض اوقات محض کوئی اچھا موقعہ نہ ملنے کی وجہ سے انسان اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔ حالانکہ وہ بڑا مفید آدمی ہوتا ہے لیکن گمنامی کی موت مر جاتا ہے۔

فنا زمانے کے سرد و گرم دیکھے ہوئے تھا۔ اس کے والد نے اسے آوارہ سمجھ کر اس کی ضروریاتِ زندگی سے بھی ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ وہ اخبار نویس سے فلمی شاعر بن گیا لیکن اس شاعری نے بھی اسے زندگی سے دور ہی رکھا۔ کتنے ہی اسٹوڈیوز کی خاک چھانتا پھرا۔ ناکامیوں نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ وہ مایوسیوں سے گھبرا کر کسی قہوہ خانہ میں بیٹھ کر تخیلی فلم تیار کرتا۔ کہانی نویس۔ مکالمہ نویس۔ گیت نگار۔ ڈائریکٹر۔ پروڈیوسر۔ ایکٹر وہ خود بن جاتا۔ ہیروئن۔ موسیقار۔ اور فنانسر اس کے سامنے مسئلہ بن کر کھڑے ہو جاتے۔ فنانس کون کرے گا؟ وہ ذہن پر دباؤ ڈال کر سوچتا۔ اسے کچھ بھی تو نہ سوجھتا۔ اس کا یہ کاغذی محل دھڑام سے گر جاتا۔ اس کے دوست جو

اس کی ہر بات پر ہاں سے ہاں ملا دیتے ہوتے۔ ایک ایک کر کے کھسکنے لگتے۔ اور اسے یاد آتا ابھی تو چائے کا بل بھی دینا ہے۔ خالی چائے ہی سہی۔ لیکن بل؟ فلمی شعلوں کی تخیل آفرینیاں تلخیوں کے گھونٹ بن کر اس کے حلق میں اٹک جاتیں۔ وہ سمندر کی تہہ میں ڈوب جاتا۔ جہاں سے اُبھرنا ناممکنات میں سے ہوتا اس کی نعش تک کے نشان مٹ جاتے۔ آخر اس نے ہار مان لی۔ زمانے کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ فریبِ نظر اور حقیقت کا فرق اس کی سمجھ میں آ گیا۔ اس نے پھر سلسلہ تعلیم شروع کر دیا۔ پہلے ایل۔ ایل۔ بی کرنا چاہا مگر پہلے ہی سال منہ کی کھائی۔ اب کی اس نے ایم۔ اے میں داخلہ لے لیا تھا۔ اب وہ کہا کرتا:۔

"جینا بھی ایک فن ہے پیارے۔ تم کیا جانو۔" اور پھر وہ مسکرا دیتا۔

(۲)

فنا نے مجھے یونیورسٹی میں داخلہ لینے کی ترغیب دی اور میں اس کے جھانسے میں آ گیا۔

سچ پوچھئے تو زندگی میں جو بوریت آ گئی تھی میں خود اس کا تریاق چاہتا تھا۔ یونیورسٹی جانے میں ایک دلچسپی تو تھی۔ مجھے ایک مشکل یہ آ پڑی کہ دفتر کے اوقات مانع پروگرام ہوتے تھے۔ بڑے صاحب کی نظروں میں میرا بڑا وقار تھا۔ اسی اعتماد کے پیش نظر میں نے نصف تنخواہ پر سمجھوتہ کر لینا مناسب سمجھا۔ مگر بڑے صاحب نے میری آمدنی میں کمی کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اور اس شرط پر مجھے اجازت دیدی کہ جتنا لیٹ آؤں آفس ٹائم کے بعد اتنا زیادہ وقت لگا لیا کروں۔ یہ صورت مجھے بہت پسند آئی اور میں نے داخلہ لے ہی لیا۔

انسان نئے نئے کلیے گھڑتا ہے۔ ان کو زندگی کے اصول بنا کر اپنے اوپر مسلط

کر لیتا ہے۔ مگر زندگی کا ہر نیا تجربہ اس میں ترمیم کر دیتا ہے۔ جو لوگ دوسروں کے تجربات سے استفادہ کرتے ہیں وہ نسبتاً اس ردوبدل سے بچ جاتے ہیں۔ میں تو اب تک ہر تجربہ خود ہی کرتا رہا تھا۔ اسی سرشت کی بنا پر میں نے زندگی کی دلچسپیوں سے کنارہ کشی کر لی، رنج والم کے کانٹوں کو سینے سے لگا لیا تھا لیکن کانٹوں سے بھی دوستی نبھ نہ سکی۔ اس رنج والم سے حظ اٹھانا چاہا لیکن اس میں بھی پھسپھساپن ہی رہا، اذیت نہ تھی۔ زندگی کیا تھی، اماوس کی رات۔ مگر جب سے داخلہ لیا تھا میری زندگی کے چور دروازہ سے روشنی کی ایک کرن پھر سے داخل ہو رہی تھی۔

ہمارے ساتھ جو لڑکیاں پڑھتی تھیں ان میں دو کی شخصیت زیادہ نمایاں تھی۔ ایک سانولی سی لڑکی تھی۔ آنکھوں پر دبیز شیشوں کی عینک۔ ہونٹ موٹے۔ چہرے کے باقی نقش مناسب۔ میانہ قد، جسم چھریرا۔ چوٹیاں دو۔ ایک کمر پر لہراتی تو دوسری سینے پر بل کھاتی۔ کمر پتلی۔ کولہے بھاری۔ لمبے لمبے ناخنوں پر کیوٹکس کا افراط سے استعمال۔ چہرہ غازے اور پوڈر کا مرہون منت۔ ہونٹوں پر تیز سرخی۔ لباس جدید ترین فیشن کا۔ دیکھا جائے تو یہ لڑکی خوبصورت نہیں تھی۔ اس کے باوجود جانے کیوں کشش تھی۔ کوئی بھی اسے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ ایک مرتبہ تو ضرور ہی ٹھٹھک جاتا تھا۔ اس نے زندگی کی بیس بائیس منزلیں طے کی ہوں گی۔ اس کے سراپا میں سب سے زیادہ پرکشش سامنے کا حصہ تھا۔ اور شاید وہ بھی اس بات سے بے خبر نہ تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ خاص انداز سے اس ابھار کو سنوارنے پر توجہ دیتی ہے۔ یہ بھی تو ایک فن ہے۔ اس کے جسم میں کچی کلیوں کی سی مہک تھی۔ اس لڑکی کا نام نوید تھا۔

شروع شروع میں میں اپنے ماحول سے کچھ بے خبر رہا۔ لیکن پھر مجھے احساس

ہوا اُفق کے اس پار کچھ سرگوشیاں ہوتی ہیں۔ ہمارے درمیان نیلے نیلے پردوں سے پارٹیشن کر دی گئی تھی۔ میں دبے پاؤں آتا۔ لیکچر سنتا اور خاموشی سے دفتر چلا جاتا۔ میرا ذہن کئی حصوں میں بٹ گیا تھا۔ کبھی دفتر میں ہوں تو کبھی اڑن کھٹولے پر۔ نوید اپنی سہیلی سے سرگوشیاں کرتی تو انجانے میں میری توجہ کا مرکز بن جاتی۔ اس وقت پروفیسر صاحب کی ایک بات بھی میری سمجھ میں نہ آتی۔ ان کی ہلکی ہلکی کھسر پھسر پروفیسر صاحب کے بلند آواز لیکچر پر چھا جاتی۔ ان دنوں جانے کیوں میں بڑا شرمیلا سا بن گیا تھا۔ ایک دن اس نے پردے کو پنسل سے ...... ذرا سا سرکا دیا۔ کنکھیوں سے میں نے دیکھا وہ شرمیلی نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے پہلی رات کی دلہن کی طرح گردن جھکا دی۔ نظریں نوٹ بک پر گر گئیں اور چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔

میں پریوں کے ملک کا کوئی کردار معلوم ہوتا تھا۔ خاموشی سے بڑی احتیاط سے قدم رکھتا ہوا آتا۔ لیکچر سنتا اور کسی سے بات کیے بغیر چپکے سے چلا جاتا۔ میں نے پردے کے اس پار کبھی جھانکنے کی کوشش نہ کی تھی۔ دوسرے لڑکوں کی طرح کبھی کوئی فقرہ نہ کسا۔ کبھی ذو معنی الفاظ چور دروازہ سے پردہ کے پار نہ پھینکے۔ مجھے محبت کا تلخ تجربہ ہو چکا تھا۔ اس لیے میں ارادتاً ایسے خیالات سے فرار حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہتا۔ فنا طنز کرتا۔ کتنی بے نیازی ہے۔ اپنے حسن پر مان کرتے ہو۔ یہ غرورِ حسن، توبہ ہے۔ نہیں میاں ٹھیک ہے۔ ہاں بھئی حق بجانب ہو۔ قدرت نے تمہیں بڑی دولت دی ہے۔ حسن۔ واہ۔ کیسے تیکھے نقش پائے ہیں۔ رنگ گورا۔ جسم نہ موٹا، نہ پتلا۔ قد نہ اللہ میاں کی سیڑھی نہ بونا۔ خون میں حدت۔ طبع میں جدت۔ خیالات میں ندرت۔ لباس میں نفاست۔ آخر گھمنڈ کیوں نہ کرو۔ میاں نخرے میں

کنواری لڑکیوں سے بڑھ کر ہو۔ کوئی نہ کوئی چڑیا پھڑ کا دو گے۔" میں مسکراتا اور
چپ ہو جاتا۔ میں تو خود گھائل تھا۔۔۔ میں تو ایسا چرکہ برداشت کر چکا تھا جس
نے مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بد مذاق اور بزدل بنا دیا تھا۔

ہماری ہم جماعت یوں تو اور لڑکیاں بھی تھیں۔ مگر ان کی شخصیتیں کچھ دبی دبی
سی تھیں۔ ایک چھوٹی موٹی سی تھی۔ نقش تیکھے۔ رنگ گندمی۔ قد چھوٹا دُبلی پتلی۔
فیشن کی دلدادہ۔ کلاس روم میں کبھی کبھی آتی۔ لیکن جب آتی سب لڑکیاں سر جوڑ
کر بیٹھ جاتیں۔ اُن کی آوازیں پُراسرار سی ہو جائیں۔ سینوں میں دھونکیاں سی
چلنے لگتیں۔ اس کے جانے کے بعد لڑکوں کا سارا دن یہی لڑکی موضوع بنا رہتا۔ بہت
سے لڑکوں کی رائے تھی یہ بڑی فلرٹ قسم کی لڑکی ہے۔ کوئی اس سے دوستی پیدا
کرنے کے منصوبے بناتا۔ کوئی لمبی آہ بھر کر کہتا آہ زرین تاج۔ وہ کتنے ہی دن غیر حاضر
رہتی۔ یہاں تک کہ لڑکے اس موضوع کو بھول جاتے۔

میں اس ماحول سے مانوس ہو گیا تھا۔ یوں تو میں ابھی تک کچھ علیحدہ علیحدہ سا
تھا۔ پھر بھی زندگی میں خوشی کی ایک غیر محسوس رمق رقصاں تھی۔ شرمیلا میں اب
بھی تھا مگر کبھی کبھی کنکھیوں سے پردے کے اس پار کسی سوراخ سے جھانک لیتا۔ نوید
میری نظروں کی آنچ محسوس کرنے کے بعد اپنی سہیلی کی طرف دیکھنے لگتی اور اگر وہ
دونوں میری طرف دیکھتیں تو میں کاپی پر نظریں جما دیتا۔ دونوں طرف کسی میں بھی
ہمت نہ تھی کہ نظریں ملا سکے۔ ایک دن ہم اکٹھے کلاس سے نکلے۔ وہ دونوں لائبریری
کی طرف جا رہی تھیں۔ میں نے ایک نظر اُن کو دیکھا اور وہ دونوں چھوئی موئی سی
بن کر ایک دوسرے میں گھسنے لگیں۔ میں نے نظریں جھکا لیں اور وہ بھاگ کر لائبریری

میں داخل ہو گئیں۔ جانے کیوں میرے ذہن میں یہ خیال کروٹیں لینے لگا کہ اس کی یہ نئی کیفیت دوسرے لڑکوں کے سامنے کیوں پیدا نہیں ہوتی۔ میرے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہوتا تھا کہ میں بھی لائبریری میں بیٹھ سکوں یا ان کے بارے میں سنجیدگی سے کچھ سوچ سکوں۔ وقت سرپٹ بھاگا جا رہا تھا۔ روز یونہی ہوتا رہا۔

ایک دن پردے کے اس پار چاندی کے کچھ سکے کھنکے۔ پھر دو ایک زمین پر آ گرے۔ پروفیسر ابھی نہیں آئے تھے۔ لڑکے خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ پردے کے اس پار سرگوشیوں میں کچھ کہا جا رہا تھا۔ باتوں کے شور میں الفاظ کی ترتیب کا تو پتہ نہ چلا۔ البتّہ مفہوم کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مجھے سنا کر کہا گیا ہو۔ آپ چاہیں تو یہ روپے حاضر ہیں۔ میرا رنگ فق ہو گیا۔ اور میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ آخر ان کو میرے حالات سے کیسے آگاہی ہوئی۔ پھر یہ تو بہت پہلے کی بات تھی۔ اب تو میرے حالات بہتر تھے۔ اس دن میں بہت بے چین اور پریشان رہا۔ میری سمجھ میں بالکل نہ آیا کہ ان کے پاس کونسا ذریعہ ہے جس سے یہ میرے ماضی سے آگاہ ہوئیں۔

اب ان دونوں لڑکیوں پر میں نے خاص توجہ دینی شروع کی۔ نوید کو تو میں دیکھ ہی چکا تھا۔ پھر یہ پردہ بھی نہیں کرتی تھی۔ دوسری لڑکی کی ایک آدھ جھلک نظر آئی تھی۔ اور اتنا بھی جانتا تھا کہ وہ بہت شرمیلی لڑکی ہے۔ نوید اسے میرا نام لے لے کر چھیڑتی اور اس کا رنگ سرخ ہو جاتا۔ میں نے اسے دیکھا وہ بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ گال سرخ اور بھرے بھرے۔ آنکھیں سیاہ، ہونٹ پتلے۔ ناک تیکھی۔ دانت چھوٹے چھوٹے موتیوں ایسے۔ عمر الھڑ۔ طبیعت میں اٹھکیلیاں۔ خود ہی شرارت کر کے خود ہی شرما جاتی۔ جسم بے حد بھرا ہوا۔ سیدھی مانگ۔ باتوں میں سادگی اس کے

حسن کے آگے غازہ پوڈر شرماتے تھے۔ اگر وہ اتنا بھاری جسم لیے نہ ہوتی تو شاید حسینۂ عالم ہوتی۔ بھاری جسم حسن کو جُدا کر دیتا ہے۔ مگر اس دنیا میں شاید وہ واحد لڑکی تھی جس کے حسن میں کوئی فرق ہی نہ آیا تھا۔ لوئیدا اس کا بازو پکڑ کر لٹک سی جاتی۔ اور ایک انداز سے کہتی۔ "چل بھی اجو" وہ بھی شرما سی جاتی۔ دونوں ایک دوسری کو چھوٹے چھوٹے پیار بھرے دھکے لگاتیں آگے بڑھ جاتیں۔

اب کبھی کبھی میں کسی لڑکے سے بات کر لیتا تھا۔ میرا اندازِ گفتگو بہت مختصر اور مہذبانہ ہوتا۔ جس دن میں کوئی بات نہ کرتا پردے کے پیچھے سے آواز آتی "آج نہیں بات کریں گے۔" پھر دوسری آواز آتی "موڈ کی بات ہے نا" اور میں شرم سے پانی پانی ہو جاتا۔ جانے کیوں؟

ان کے دل تھے کہ ہر لمحہ زعفران زار بنے رہتے۔ سینوں میں اکثر ڈکر ڈسی مچی رہتی۔ میرے دماغ میں کوہ قاف کی پریاں ناچنے لگتیں۔ ذہن معطر فضائیں تیار کرتا۔ بہاروں پہ بہاریں آتیں۔ فضا میں بڑی رومان پرور نغمگی پیدا ہو جاتی۔ دلوں میں پھلجڑیاں سی جلتیں۔ خاموش پیغام آتے اور جاتے۔ جذباتی طور پر ہم اتنے مانوس ہو چکے تھے کہ علیحدہ ہونا مشکل نظر آتا تھا۔ مگر آج تک ایک بات بھی تو ایک دوسرے سے نہ ہو سکی تھی۔ مجھ میں جرأتِ رندانہ نہیں تھی۔ ان کو غرورِ نسوانیت اجازت نہ دیتا ہو گا۔ لیکن چھیڑ چھاڑ بڑے لطیف انداز میں شروع رہتی۔ یہی ہماری زندگی کا نغمہ تھا۔ جس کے سر دُھن میں ہم آہستہ آہستہ پگھلے جا رہے تھے۔ کوئی نامعلوم روانی ہمیں اپنی طرف بہائے لیے جا رہی تھی۔ نہ جانے کس سمت؟ کون جانے آگے کونسا موڑ آنے والا تھا۔ لیکن ہم نے تو کبھی کسی موڑ کے متعلق سوچا بھی نہیں تھا۔ خیالوں ہی خیالوں میں کئی محل تیار کرتے اور پھر اچانک پروفیسر

صاحب کے تند و تیز الفاظ ہمیں چونکا دیتے۔ پریوس ایر ختم ہو رہا تھا۔ ہمارے احساسات کی تتلیاں خزاؤں میں بھٹکنے لگی تھیں۔ ایسے دنوں میں ہم بہت اداس رہتے۔

○

گھپ اندھیرا چھٹ چکا تھا!

ہماری کلاس دوبارہ شروع ہو چکی تھی۔ یہ ہمارا فائنل ایر تھا۔ مگر اب کی فضا میں کچھ اجنبیت کا سا احساس تھا۔ امسال ہمارا کمرہ بھی بدل دیا گیا تھا۔ دو چار دن اسی طرح اداسی میں گزر گئے۔

میں برق رفتاری سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا ابھی آخری سیڑھی پر پہنچا ہی تھا کہ فنا مجھے دیکھتے ہی جلد جلد قدم اٹھاتا میری طرف بڑھا۔ اس کے پھیپھڑے تیز تیز ہوا دے رہے تھے۔ اس کے چہرے پر کچھ کچھ پریشانی کے آثار تھے۔ کانپتی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔

وہ لڑکی کون ہے؟

کونسی لڑکی؟

"وہ جو تمہارے کمرے میں بیٹھی ہے۔"

"کیوں؟ خیریت تو ہے؟" میں نے چبھتی ہوئی نگاہ اس پر ڈالی۔

"میں نے تمہارے متعلق اسے پوچھا تھا۔"

"پھر؟"

"وہ تو جنگلی بلی کی طرح تیکھے پنجوں سے مجھ پر جھپٹ پڑی۔"

فنا کا رنگ اڑا اڑا سا تھا۔ آج فنا وہ فنا نہ تھا۔ جو محبت کو دماغ کا خلل

کہا کرتا تھا۔ جو صاحباں کو بکی پر بٹھانے، قیس کی صحرا نوردی، سوہنی کے کچے گھڑے پر تیرنے، فرہاد کے نہر نکالنے، رانجھے کے فقیر بننے، ایڈورڈ ہشتم کے تخت چھوڑنے اور تاج محل بنانے کو پاگل پن سے تعبیر کرتا تھا۔ آج تو فنا کا رنگ نورجہاں کے مزار کی طرح اڑا ہوا تھا۔ محبت کی منطقی تصریحات کرنے والا، اسی طوفان کی رو میں خود ہی بہہ گیا تھا۔ اسے اپنی کیفیت کا احساس ہوا تو اس نے اپنے موڈ میں بے نیازی کا عنصر شامل کرنے کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"یار اچھی لڑکی ہے"

"کہیں گھائل تو نہیں ہو گئے؟" اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے خفت سی محسوس کی۔ میں نے اسے اور تنگ کرنا چاہا۔

"تم تو ایک شعر سنا کر عشق کر سکتے ہو پیارے۔" آج مجھے طنز کرنے کا موقعہ مل گیا تھا۔ اور میں نے اس کے بوسیدہ الفاظ دہرا دیئے تھے۔

وہ اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ فنا ایم اے کر چکا تھا اب وہ پی۔ ایچ۔ ڈی کا طالب علم تھا۔ وہ کبھی شاعر بھی تھا اور اخبار نویس بھی۔ وہ کہا کرتا تھا اس ملک کا سب سے کم عمر ڈاکٹر ہوگا۔ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک پیدا ہو جاتی تھی۔ وہ سانولا سا لڑکا تھا اور اس کی ساری شخصیت پر ہر وقت شاعرانہ سا موڈ طاری رہتا تھا۔ اس کے بارے میں سوچتے سوچتے مجھے خیال آیا۔ "اس نے ابھی ابھی کس لڑکی کو دیکھا تھا؟" یہ سیلانی سا آدمی اس رو میں کیسے بہہ نکلا۔" میں نے کلاس روم میں قدم رکھا۔ اس لڑکی کے چہرے پر نظر پڑی اور مجھ پر ایک خوش آیند سی برق گری۔ یہ ایک اجنبی لڑکی تھی۔ اور کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی۔ ابھی کلاس لگنے میں کچھ وقت باقی تھا۔ فضا یخ

بستہ ہو رہی تھی۔ جب سے سردی کا موسم شروع ہوا تھا۔ لڑکے کچھ لیٹ ہی آنے لگے تھے۔ کبھی تو یوں ہوتا پروفیسر صاحب حاضر ہیں اور طالب علم ایک بھی نہیں اور اکثر یوں ہوتا جب پروفیسر صاحب آتے دو تین طالب علم ہی ہوتے اور پھر ایک ایک کر کے آنا شروع ہو جاتے۔ اور آدھا لیکچر ختم ہونے تک اچھی خاصی گہما گہمی ہو جاتی۔

میں اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ سارے ماحول میں زنگار رنگ تتلیاں اڑنے لگیں۔ میرے ذہن میں رنگ و نور بھر گیا۔ تخیل طلسمی مناظر پیدا کرنے لگا۔ دل سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ میں نے کنکھیوں سے دھڑکتے دل کے ساتھ اسے دیکھا۔ وہ ٹالسٹائی کا افسانہ "تھری آرچینیس آف لینڈ" بڑی محویت سے پڑھ رہی تھی۔ میں نے پھر نظریں جھکالیں۔ لیکن میری بے چینی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اب کی میں نے اس کے نوشگفتہ گیت گاتے جسم پر بھرپور نظر ڈالی۔ اس کے بال گھنگھریالے اور لمبے تھے۔ دو چوٹیاں تھیں۔ آنکھیں سیاہ، گردن شاعرانہ حد تک صراحی دار، سرو قد، بہت لانبی بھی نہیں پتلی سی تھی۔ مگر بدن میں حسن اور نکھار تھا۔ رنگ گورا، گال سرخی سے عاری۔۔۔ لیکن گالوں کی زردی مائل سفیدی بھی اپنے اندر ایک خاص قسم کی کشش لیے ہوئے تھی۔ دانت موتیوں کے دانے۔ ہونٹ پھول کی پتیاں۔ آدھا سر ریشمی پھول دار دوپٹے سے ڈھکا ہوا۔ آدھا ننگا۔ شلوار قمیض میں ملبوس۔ گرم کوٹ اوڑھے۔ وہ بڑے اطمینان سے بیٹھی تھی۔ اور میں طوفان میں ہچکولے کھا رہا تھا۔ اس طوفان کی اسے خبر تک نہیں تھی۔ اس نے میری موجودگی کو اپنی شانِ استغنا میں ڈبو دیا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ بھی میری طرف نہیں دیکھا۔ میرا نوٹس تک نہ لیا۔ اس کے چہرہ پر کسی قسم کے کوئی آثار پیدا نہیں ہوئے۔ یہ بے نیازی دانستہ بھی نہیں تھی۔ شاید یہ سب محض میرا احساس ہو۔ ہوا کا ایک سرد

اور تیز جھونکا آیا۔ میں چونکا۔ خیالات منتشر ہو گئے۔ دروازے کی طرف دیکھا۔ میرا جی چاہا۔ دروازہ بند کر دوں۔ کلاس روم میں وہ اکیلی تھی۔ اس کی موجودگی ہی مانع ہوئی۔ اور ساتھ ہی مجھے اپنی ہستی کا شدت سے احساس ہوا۔ یخ بستہ ہوا کا ایک اور تھپیڑا لگا۔ مجھے اپنے احمقانہ تفاخر پر شرم محسوس ہونے لگی۔ بقول فنا میں بھی اپنے آپ کو خوبصورت سمجھتا تھا۔ مگر آج تو شکست فاش ہوئی تھی۔ میں نے محسوس کیا میرا رنگ سرخ ہو رہا ہے۔ اتنے میں اجو داخل ہوئی۔ ساری فضا تھر تھر کانپ اٹھی جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ میرا رنگ اور بھی اڑ گیا۔ اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا۔ پھر اس کی طرف۔

"ہما یہ کیا ہے؟"

اجو چوکھٹ کو اٹھا رہی تھی۔ جو کونے میں پڑی تھی۔ ایک ہی ساعت میں اس نے ہمارے درمیان چوکھٹے کھڑی کر دی۔ جس میں گہرے نیلے رنگ کا پردہ لگا ہوا تھا۔ یہ پردہ ہمارے راستے میں چٹان بن کر فلک کی بلندیوں تک جا پہنچا۔ وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی اور میں سوچنے لگا یہ ہما ہے۔ اس کے آنچل کا سایہ میرے سر سے گزر جائے تو میں بادشاہ بن سکتا ہوں۔ من کا بادشاہ۔ خوشیوں کا بادشاہ۔ محبت کا بادشاہ۔ حسن و عشق کا بادشاہ۔ لیکن اجو نے تو ہمارے درمیان ناقابلِ عبور پہاڑ کھڑا کر دیا تھا۔ اس پر بھی اکتفا نہ کیا۔ خود بھی دیوارِ چین بن کر اس کے آگے کھڑی ہو گئی۔ اس دیوار میں شگاف کیسے کیا جائے؟ اس سوال کے حل سے پہلے ہی پروفیسر صاحب آ گئے تھے۔ لیکچر شروع ہو گیا۔ کلاس میں سب طالب علم آ چکے تھے۔ لیکن میں تو کوہ قاف کی وادیوں میں گھوم رہا تھا۔ کسی طلسم کی تلاش میں۔ مجھے لیکچر کی بالکل سمجھ نہیں آئی تھی۔ خدا جانے آج پروفیسر صاحب

کا لیکچر اتنا مبہم اتنا غیر واضح کیوں تھا۔

طالبات کے اندازِ گفتگو سے قیاس ہوتا تھا ہما دو چار دن سے ہتھ آتہ آ رہی ہے۔ مگر میں تو اتنے دنوں بے خبر ہی رہا۔

ہما کے علاوہ دو ایک اجنبی لڑکیاں اور بھی داخل ہوئی تھیں۔ یہ غالباً ہم سے پہلے سالوں کی طالبات تھیں اور کسی وجہ سے اپنے لیکچر پورے نہ کر سکی تھیں۔ شبنم دل بھی انہی دنوں داخل ہوئی۔ وہ لانبے قد کی تھی۔ کھڑی ہوتی تو چوکھٹ کی اوپر والی چوبی جالی سے اس کی مرمریں گردن دکھائی دیتی۔ اس کی آنکھیں سیاہ اور موٹی موٹی تھیں۔ جسم نہایت ہی متناسب اور بھرا بھرا۔ گال گلاب کے کٹورے۔ بدن کے ہر حصہ میں بجلیاں کوٹ کوٹ کر بھری تھیں۔ لہجہ میں سمندر کی گھنٹیوں ایسا تقدس تھا۔ آنکھیں نیم وا کر کے اس کی طرف سکون سے دیکھئے تو پری نظر آتی تھی۔ وہ اپنے سیاہ لانبے بالوں میں پھول لگا لیتی تھی۔ شبنم دل ہماری کلاس کی سب سے خوبصورت لڑکی تھی۔ لیکن میری سجدہ گاہ ہما تھی۔

ہما کی شخصیت اس سارے ماحول سے بالکل الگ تھلگ تھی۔ وہ لڑکیوں سے بھی کھچی کھچی رہتی۔ ذرا سی بات پر چڑ جاتی۔ اجو کو تو خاصہ مشغلہ ہاتھ آ گیا تھا۔ پاڑیشن کے اس پار جو ریکارڈ لگتا اس کے صوتی اثرات ہم کو بھی محظوظ ہونے کا موقعہ دیتے۔ البتہ چہروں کے خطوط اور بدلتی کیفیات ہم نہ پڑھ سکتے تھے۔ ہما درمیانے قد کی لڑکی تھی۔ ناک نقشہ بھی اچھا تھا۔ جسم متناسب تھا۔ فیشن کی دلدادہ نہیں تھی۔ طبیعت میں بڑی سادگی تھی۔ بالوں میں کبھی کنگھی کرتی کبھی نہ کرتی۔ بات کرنا پہاڑ اٹھانے کے برابر سمجھتی۔ رنگ نہ گورا تھا نہ کالا۔ نہ گندمی نہ پیلا۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا گورے رنگ پر راکھ کی سفیدی بکھر گئی ہو۔

حنا کا چڑچڑا پن لڑکیوں کیلئے ایک اچھا خاصا مشغلہ تھا ہم سب کو بھی اس کا بات بے بات پر چڑھانا بڑا لطف دیتا۔ وہ جتنا سنجیدہ رہنے کی کوشش کرتی اسے اتنا ہی ستایا جاتا۔ کلاس میں ذرا بقراطیت چھانے لگتی تو کوئی غالب کا حنا کے متعلق مصرعہ پڑھ دیتا۔ اجو آہستہ سے کہتی دیکھو یہ تمہارا نام لے رہے ہیں حنا! اور وہ اور بھی چڑ جاتی۔ ہم سب ہنس ہنس کر دوہرے ہو جاتے۔ ایک دن کوئی ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا کہ پروفیسر صاحب آ گئے۔ یہ ذرا ڈسپلن کے زیادہ ہی پابند تھے۔ کلاس میں کبھی نہیں ہنستے تھے۔ شاید زندگی میں بھی کبھی نہ ہنسے ہوں "کچھ مجھے بھی تو بتاؤ؟" ہنسی کا آبشار تھا کہ فرازِ کوہ سے گر رہا تھا۔ اب اس کا بہاؤ کم ہو تو کوئی بتائے۔ وہ بل کھا کر ہی تو رہ گئے۔ "کچھ مجھے تو بتاؤ میں بھی آپ کے ساتھ ہنسوں۔" ہم پھر بھی اس دھارے کے آگے بند نہ باندھ سکے۔ اور وہ ناراض ہو کر کلاس چھوڑ کر چلے گئے۔

ہماری کلاس کیا تھی مانو رنگین مزاج فرزانے تھے جو ایک دوسرے پر فقرے چست کرتے رہتے تھے۔ سارا ماحول مانی کا مرقع ارژنگ بنا ہوا تھا حسن و عشق کا سنگم تھا۔ ذہن نور افشاں تھے۔ دلوں میں رنگوں کی قوس و قزح پیدا ہوتی۔ امنگوں کی تتلیاں اڑتیں کبھی لبِ احمریں پر جا بیٹھتیں۔ کبھی نازک رخساروں کا رس چوستیں۔ کبھی سینوں کے زیر و بم پر بیٹھ کر حسین جھولا جھولتیں۔ فضا میں دلوں کی گرمی سے چنگاریاں سی اڑتیں۔ محبت کے جگنو سے جگمگاتے۔ محبت سے سرشار آنکھوں کی روشنی ہلکی ہلکی لو دیتی۔ فضا گنگناتی۔ دلوں میں حسن و عشق کے دیپک جلتے۔ خاموش پیغام آتے اور جاتے۔ بڑا رومان پرور ماحول پیدا ہو جاتا۔ فضا نزہت جان بن جاتی تھی۔ دل کاشفۂ اسرار تھے۔ دلوں میں مونا لزائیں تھیں اور ذہنوں میں شاہد رعنا چمن تھے۔

دل کی گہرائیوں سے بخارات اٹھتے ، اڑتے اور ذہن کی وادیوں سے نکل کر اوج ثریا تک اڑتے ہی رہتے۔ کچھ عرصہ اسی طرح گزرا کہ یونین کے نئے الیکشن کا نقارہ بجا۔ امسال دستور سے ہٹ کر کچھ بے وقت ہی الیکشن ہو رہا تھا۔ میرا نام نائب صدر کے لیے پیش کیا گیا۔ میرے مقابلے میں ایک گیسوؤں والے کہنہ مشق شاعر تھے۔ مقابلہ سخت تھا۔ بڑی کنوینسنگ کی ضرورت تھی۔ راہ میں چٹانیں نظر آرہی تھیں۔ میں تو پہلے قدم پر ہی تھکے ہوئے راہی کی طرح بیٹھ گیا۔ میرے دوستوں نے پروپیگنڈہ جاری رکھا۔ دوستوں کی ہمت سے مجھے بھی کچھ احساس ہوا۔ سب سے پہلے میں نے ایک شاطرانہ چال چلی اور ایک پورے گروپ کو اپنے پھٹے ہوئے دامن کے ساتھ باندھ لیا۔ اب طالبات کے ووٹ حاصل کرنا تھے۔ یہ ذرا ٹیڑھی کھیر تھی۔ دو ہی لڑکیاں ایسی تھیں جن کے ساتھ میں بات کر سکتا تھا۔ ایک نوید اور دوسری اجو۔ لیکن آج تک مانوسیت کے باوجود ان سے کبھی بات ہوئی نہ تھی۔ میں سوچ میں ڈوب گیا۔ یہ بھی تو ایک امتحان تھا۔

مجھے کسی سے پتہ چلا اجو میرے ایک دوست کی عزیزہ ہے۔ دو ایک لڑکوں کے ساتھ میں نے اُن کی رہائش گاہ کا رخ کیا۔ اور راہ میں سوچتا رہا۔ بات کو کس طرح شروع کروں گا۔ کچھ خوشی سی تھی۔ کچھ خوف تھا۔ مسرت کی ایک کرن سی پھوٹ رہی تھی۔ وہاں پہنچنے کے بعد میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ کال بیل پہ ہاتھ رکھا تو گھنٹی کے ساتھ ہی دل کے کواڑ بھی بج اٹھے۔ مگر یہ تاثر بھی جلد ہی ختم ہو گیا۔ میرا دوست گھر پہ موجود نہیں تھا۔ اجو بھی نہیں تھی۔ البتہ میرے ساتھیوں نے پیغام پہنچا دیا۔

اگلے دن کلاس میں بیٹھے بیٹھے میں نے کتنے ہی فقرے آغاز کے لیے سوچے۔ مجھے نوید سے بھی تو کچھ کہنا تھا۔ میں اپنے دروازے سے نکل کر طالبات والے دروازے

کی طرف گیا۔ دروازہ آہستہ آہستہ نوک کیا۔ اس سے پہلے کہ نوید آئے میں سوچ رہا تھا۔ اسے دوسری طالبات سے ووٹ لے کر دینے کے لیے بھی کہوںگا۔ جب وہ آئی تو مجھے دیکھ کر اس کا رنگ فق ہوگیا۔ میں نے بھی اپنا رنگ اڑتا ہوا محسوس کیا۔ اسی گھبراہٹ میں جانے میں نے کیا کہا اور اس نے کیا سُنا۔ اور پھر وہ جلدی سے الٹے پاؤں مڑ گئی۔

اس رنگا رنگی نے مجھے زندگی کے ایک نئے موڑ پر لا کھڑا کیا تھا۔ دفتر میں بھی مجھے ترقی مل گئی تھی۔ الیکشن میں جیت گیا۔ میری فرم نے مجھے اسسٹنٹ مینجر سے مینجر بنا دیا تھا۔ اور وہ مجھے کچھ دیر کے لیے انگلینڈ بھیجنا چاہتے تھے۔ مگر یہ ماحول بھی انگلینڈ سے کچھ کم پر کشش نہ تھا۔

اب اس ماحول میں سرگوشیاں نہیں رہی تھیں۔ ان کی جگہ جذبات کی مترنم گھنٹیاں بجنا شروع ہوگئی تھیں۔ دلوں میں آگ کی تپش کچھ اور بھی بڑھ گئی تھی۔ جبین سنسار دن پر بہاروں کی تازگی اور بھی نمایاں نظر آنے لگی تھی۔ طنز و مزاح کے تیر طرفین سے چلتے۔ کبھی تو یوں محسوس ہوتا جیسے میدان میں گتکا بازی شروع ہو چکی ہو۔ مگر یہ لڑائی کا میدان نہیں تھا۔ ایک دوسرے پر بڑے خلوص اور محبت سے وار کیے جاتے۔ ہر وار اپنی جگہ ایک پیغام ہوتا۔ دلوں کی دھڑکنوں کے ساتھ پینترے بدلے جاتے۔ کوئی اپنے آپ کو بچاتا تو کوئی شوق سے گردن جھکا دیتا۔ اور جب اپنا وار کرنے کا موقعہ آتا تو ہلکا سا اشارہ کر کے ایک قدم پیچھے ہٹ جاتا۔ اسی قرب نے تکلف کی کئی دیواریں گرا دی تھیں۔ اب وہ پہلا سا حجاب نہ رہا تھا۔ بے تکلفی یہاں تک بڑھی کہ ایک دن کسی نے پردوں پر تیزاب پھینک کر ان کو چھلنی کر دیا۔ صبح جو بھی آتا بڑا

حیران ہوتا۔ یہ کام اتنی صبح ہُوا تھا کہ اتنی جلد کسی طالب علم کا آنا ناممکن سا لگتا تھا۔ یا ہو سکتا ہے یہ کام چھٹی کے بعد کسی مناسب موقعہ پر ہو گیا ہو۔ کتنی ہی دیر قیاس آرائیاں ہوتی رہیں۔ آج کچھ بے پردگی زیادہ ہی ہو رہی تھی۔ کچھ لڑکیوں نے اس فعل پہ بُرا منایا اور بڑی جُزبز ہوئیں۔ بعض خوش تھیں۔ اور وہ دل ہی دل میں چہک رہی تھیں۔ آزادی کی مُسرت عین فطرت ہے۔ کچھ لڑکیاں شوخیاں بھی کر رہی تھیں۔ وہ لڑکوں کے ساتھ برابر کی شریک تھیں۔ نوید تو پردہ ہی نہیں کرتی تھی۔ سائیکل پر آیا کرتی تھی۔ اجو کی مزاحیہ حس کو اور بھی جِلا ملی۔ میں کلاس روم میں داخل ہوا تو طرح طرح کی آواز سنیں۔ میری سمجھ میں ابھی تک یہ معاملہ نہ آ رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ آج میں کلاس میں دیر سے پہنچا تھا اور پہلے کے واقعات سے بے خبر تھا۔ اسی بات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نوید نے ہنسی کو دباتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو یہ کام دیپک صاحب کا نظر آتا ہے۔" میں نے ایسے معاملے میں مذاق کا بُرا منایا اور فوراً تلخ لہجے میں کہا۔ "جی یہ کام دیپک صاحب کا نہیں۔"

"اپنے آپ کو صاحب نہیں کہا کرتے۔" اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ باقی سب لڑکیاں بھی ہنسنے لگیں۔ حنا تک خوب ہنسی۔ ہما بھی مسکرا رہی تھی۔ اجو کے قہقہے تو الامان الحفیظ۔ مجھے بڑی خفت سی محسوس ہوئی۔ مگر تیر نکل چکا تھا۔ بلبل نے صیاد کے پر کاٹ دیئے تھے۔

ایک واقعہ اور اسی طرح کا پیش آیا۔ میرے تحت الشعور میں ہما بسی ہوئی تھی۔ ہنسی مذاق کو تو محض بہانہ بنایا جاتا۔ اسی آڑ میں میں سچ مچ اسے چاہنے لگا تھا۔ جی چاہتا تھا کاش ہما پیار کے آنچل کا ہلکا سا سایہ ہی مجھ پر کر دے۔ میں سوچتا کتنا فرحت بخش،

کتنا پُرسکون، کتنا جاں فزا، کتنا دلکش ہوگا یہ سایہ۔ میں اسے دیکھتا آنکھیں جلتیں ہیں نقشِ فریادی بن جاتا اور اسے ایک محویت کے عالم میں دیکھتے ہی چلے جاتا۔ سب لڑکیاں کھِل کھلا کر ہنسنے لگتیں۔ اپنی محبت پر پردہ ڈالنے کی خاطر میں بھی ان کے ساتھ شامل ہو جاتا۔ یہ ہنسی کے پیار بھرے فوارے، محبت کے آبشار، میری نظروں کی شبنم کو اپنے گہرے نیلے پانیوں کی تہہ میں چھپا لیتے۔ اب ہما بھی شاید کچھ زیادہ بے بہرہ نہیں تھی وہ بھی میری آشفتہ سری سے ناآشنا نہ رہی تھی۔ میری متجسس نظریں پردے کا باریک سے باریک سوراخ بھی ڈھونڈ لیتیں۔ ایک دن اس نے دروازے میں قدم رکھا ہی تھا کہ میں نے اپنے مخصوص انداز میں پیار بھری فقرہ بازی شروع کر دی۔ وہ اجو کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔ "صبح ہی صبح ...... ذرا صبر نہیں ہوتا۔ مجھے یہ جان کر بے حد مسرت ہوئی کہ میری دیوانگی کا اسے احساس تو ہے۔ میں نے اسے اور زیادہ ستانا چاہا اور ذو معنی الفاظ میں خیریت دریافت کرنے لگا۔ میں اٹھ کر سب سے پچھلی سیٹ پر جا بیٹھا۔ کرٹن اتنا لمبا نہیں تھا۔ پچھلی سیٹ سے وہ مجھے صاف نظر آنے لگی۔ ہما نے کرٹن اٹھایا، تہہ کیا اور کونے کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ میری نظریں جھک گئیں۔ مجھے اس طرح کی شکست واقعی ابھی تک کوئی بھی تو نہ دے سکا تھا۔

جذبات کی رو میں یا موڈ کی سرور انگیز لہر میں میں شاید حد سے تجاوز کر گیا تھا۔ حالانکہ جب بھی لڑکے حد سے تجاوز کرنے لگتے میں ان کو روک دیتا۔ مجھے معلوم تھا بات کا بتنگڑ بنتے دیر نہیں لگتی۔ میں بھری محفل میں ہی کہہ دیتا ٹھنڈا کر کے کھاؤ میاں زبان پر چھالے پڑ جائیں گے۔ ذرا دھیرے دھیرے، رام بھلی کرے گا۔ اور سب ہنسنے لگتے۔ ایک دن میں کلاس میں آیا تو دیکھا دونوں طرف سے جدید انداز میں

صف آرائی ہو چکی ہے۔ معرکہ خاصا معلوم ہوتا تھا۔ یہ پہلا موقعہ تھا جب واقعی اتنی سنجیدہ الزام تراشی ہوئی تھی۔ ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالی جا رہی تھی۔ اس دن مجھے زکام کی شکایت تھی طبیعت کافی ناساز تھی مگر کلاس میں آئے بغیر دل نہ بہلتا تھا۔ اسی لیے آ گیا تھا۔ میں ناک کے قریب بار بار ٹشو ےجاتا۔ بولنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ ذرا آرام چاہتا تھا۔ مگر نوید تو جو منہ میں آتا تھا کہے جا رہی تھی۔ ایک لڑکے پر اس نے بڑی سنجیدگی سے اور قطعی انداز میں سنگین الزام لگا دیا۔ اور مجھے یہ احساس ہوا کہ یہ تو سب لڑکوں کی توہین ہے۔ مجھے یاد آ گیا "آپ اتنی ہی پردہ نشین ہیں تو کسی لڑکیوں کے ادارے میں داخلہ لیا ہوتا" میں نے بیچ میں وکالت کے فرائض سنبھال لیے اور دلائل دینے لگا۔ "آپ ہمیں اوباش سمجھتی ہیں؟" میں آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ اس نے بھی قینچی کی طرح زبان چلائی۔ آج بے زبان دوستی اذیت ناک دشمنی میں بدل گئی تھی۔ اس نے کہا "میں ابھی ہیڈ سے شکایت کرتی ہوں۔" میں نے کہا "تمہیں روکا کس نے ہے۔" بات تو تو میں میں تک پہنچی۔ بیشتر لڑکوں کی سٹی گم ہو گئی۔ بات کچھ زیادہ ہی بگڑ گئی تھی۔ سب لڑکیاں واک آؤٹ کر گئیں۔ پیچھے دیکھتا ہوں تو لڑکے بھی ایک ایک کر کے کھسک رہے تھے۔ اور تو اور جس لڑکے کی وجہ سے یہ سارا دنگا ہوا تھا۔ اس نے بھی نظریں پھیر لی تھیں۔ جانے میں کیوں اسے ہمیشہ اپنا دوست سمجھتا رہا۔ حالانکہ اس نے پہلے بھی میرے ساتھ دو ایک مرتبہ ایسے ہی بے وفائی کی تھی۔ الیکشن میں ووٹ تک میرے خلاف دیا تھا۔ مگر جانے میں اسے کیوں دوسروں کی نسبت چاہتا رہا تھا۔ میں ہر خوبصورت چیز کو تحسین کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ مجھ میں جمالیاتی حس بہت زیادہ ہے مگر وہ تو چپٹی سی ناک والا تھا۔ البتہ وہ قابل ضرور تھا اور شاید یہی اس کا حسن تھا۔ میں نے ووٹ والی بات کو نظر انداز کر دیا تھا۔ ووٹ تو خیر

نوید نے بھی میرے خلاف ہی دیا تھا۔ حالانکہ اجو نے اسے کہا بھی تھا۔ یہ تو خیر گزری ہوئی باتیں تھیں۔ دیکھنا تو اب تھا کہ چند لمحوں بعد کیا ہونے والا ہے۔ میری شکایت کرتے وقت نوید جانے کیا کیا کہہ جائے، ہیڈ کے سامنے جاتے ہوئے مجھے شرم آئے گی۔ میں نے سوچا چلو جو ہو سو ہو۔ آئندہ کسی کے معاملے میں ٹانگ نہیں اڑاؤنگا۔ اب جو کچھ ہو چکا اس پر پریشان ہونے سے فائدہ؟ اب کی تو خیر غلطی کا نتیجہ بھگتنا ہی پڑے گا۔ اور میں سزا کے لیے تیار ہو گیا۔ میں نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔ مجھے یقین تھا کہ آج جرمانہ ورمانہ ہو گا۔ میں نے یونہی نوٹس بورڈ کو ٹٹولا حالانکہ ابھی اس مرحلے میں تاخیر تھی۔ وہاں وہی پرانے نوٹس لگے ہوئے تھے۔ میں سوچ رہا تھا اگر سب لڑکے آپس میں یک جان ہو کر ڈیفنس کریں تو معاملہ کی نوعیت بدل جائیگی۔ اس سنگین الزام سے بچت کا ایک پہلو نکل آئے گا۔ ہمارا جرم اگر یہی ہے کہ ہم لڑکے ہیں تو وہ کونسا چھوٹی موئی ہیں۔ وہ بھی تو لڑکوں سے دو قدم آگے ہیں۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے مجھے کچھ اور لڑکے ملے۔ انہوں نے بتایا۔ معاملہ رفع دفع ہو گیا ہے۔ اجو نے شکایت کرنے کی مخالفت کی ہے۔ دوسری لڑکیاں بھی کہنے لگیں یہ مناسب نہیں ہے۔ جان بچی۔ میں خوش خوش لائبریری کی طرف گھوم گیا۔ اجو اور نوید کرٹن کے پیچھے بیٹھی تھیں۔ اور یوں ظاہر کر رہی تھیں جیسے غرقِ مطالعہ ہوں۔ میں نے ایک رسالہ اٹھا کر اس کے ورق جلد جلد اس انداز سے الٹ پلٹ کرنے شروع کیے کہ کاغذ کی کھڑکھڑاہٹ سے پورا کمرہ بھر گیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ شریر نظروں سے اُن کی طرف دیکھتا جاتا۔ اجو کہنے لگی "نوید کسی کو انٹرفیر نہیں کرنا چاہیے۔" میں نے ورق الٹنے میں اور بھی زیادہ سے زیادہ کھڑکھڑاہٹ پیدا کی اور ساتھ ہی ساتھ اپنا جوتا بھی فرش کے ساتھ رگڑنے لگا۔ اجو ہنسنے لگی۔

"بچاری نوید کب سے رو رہی ہے۔"

میرا پارہ اس وقت بالکل اترا ہوا تھا اور میں بے حد خوش تھا۔ میں نے اجو سے کہا۔

"میری صلح کروا دیں۔"

وہ کہنے لگی "آپ پہلے معافی مانگیں۔" میں نے کہا "کیسے مانگوں؟"

"میرا مطلب ہے کیا طریق اختیار کروں؟" اجو ہنسنے لگی۔ "کسی خاص طریق کی ضرورت نہیں۔ بس ذرا سا کان پکڑ کر معافی مانگ لیجیئے۔ نوید بڑی اچھی لڑکی ہے آپ کو فوراً معاف کردے گی۔" میں نے کہا "کہیں کان پکڑنے سے یہ اور نہ ناراض ہو جائیں۔" اجو کی ہنسی کا فوارہ پھوٹ پڑا "خوب صاحب۔ بڑے ہوشیار ہیں۔ جی نوید کا کان نہیں اپنا کان پکڑیئے گا۔" یہ سُن کر نوید بھی ہنسنے لگی۔ کہنے لگی "ویسے ہی مانگ لیجیئے میرا مطلب ہے بغیر کان پکڑے۔" وہ پھر ہنسنے لگی۔ میں نے بڑا سنجیدہ بنتے ہوئے کہا۔ "مِس نوید صاحبہ واقعی مجھے بڑا افسوس ہے۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ میری وجہ سے آپ کو جو اذیت ناک دُکھ پہنچا مجھے اس کا نہایت افسوس ہے۔" نوید کہنے لگی آپ کو سچ مچ سنجیدہ ہو گئے ہیں میں تو مذاق کر رہی تھی۔ میں خود اپنے کیے پر نادم ہوں۔ نوید بھی معذرت کرنے لگی۔ اجو کہنے لگی مٹھائی کھلایئے پھر باقاعدہ صلح ہو گی۔ میں نے پیسٹری اور چائے منگوائی کہنے لگیں ہم تو نہیں پئیں گے۔ میں نے کہا پھر کہا کیوں تھا۔ اب تو آپ کو پینا ہو گی بصورت دیگر میرے جتنے پیسے خرچ ہوئے ہیں وہ مہربانی فرما کر ادا کر دیجیئے۔ دونوں ہنسنے لگیں۔

مجھے اچانک احساس ہوا اس ہنسی میں ہما کے قہقہے بھی تو شامل ہونا چاہئیں۔ یہ احساس ایک خواہش تھی۔ ایک تشنگی۔ ہما کبھی لائبریری میں نہیں آتی تھی۔ اس کا

قاعدہ تھا کلاس سے سیدھی گھر جاتی۔ میرا جی چاہتا وہ بھی اجو اور نوید کی طرح میرے ساتھ قہقہے لگائے۔ وہ بھی فقرے کسے مگر وہ تو اکثر خاموش رہتی۔ اگر کبھی بات کرتی بھی تو اتنی آہستہ کہ ہمیں سمجھ ہی نہ آتی کیا گل افشانی ہوئی ہے۔ جب کوئی زیادہ ہی مزاحیہ بات ہوتی اس کے باریک باریک نازک یاقوتی ہونٹوں پر ایک پیاری سی مسکراہٹ پھیل جاتی۔ ایک دن میں مبھا پڑھ رہا تھا۔ اجو کہنے لگی ہما کے متعلق سوچا جا رہا ہے۔ بے اختیار میرے منہ سے نکلا بڑی سلجھی ہوئی لڑکی ہے۔ اگلے دن وہ آئی تو تلخ لہجے میں دوسری لڑکیوں کو مخاطب کر کے کہنے لگی "میرے متعلق کسی کو رائے دینے کا کیا حق ہے"! اجو کہنے لگی تمہیں اچھا بھی کوئی نہ کہے۔ تم بھی عجیب لڑکی ہو بھئی۔ ایسے ہی بیچارے کے پیچھے پڑ گئی ہو۔ اجو دبے لہجے میں ہنس بھی رہی تھی۔ یہ ساری شرارت اسی کم بخت کی تھی۔ وہ چلی گئی تو اجو نوید سے کہنے لگی "آ تجھے میں ایک انوکھی مگر پیاری سی خبر سناؤں۔ وہ اس کے منہ کی طرف تکتی رہی۔ اجو نے سرگوشیانہ انداز میں کہا۔ "ہما اپنے کزن سے محبت کرتی ہے۔ وہ روز اسے یہاں چھوڑنے آتا ہے۔" پھر وہ ایک مصنوعی لمبی آہ بھر کر کہنے لگی "ہائے ہمارا کوئی کزن نہیں بنتا"..... میں سمجھ گیا تھا کہ وہ مجھے چھیڑ رہی ہے۔ ادھر سے میں نے بھی نشتر زنی کی "ہائے کوئی مجھے کزن بنا لے۔" دونوں کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ اتنے میں شبنم دل اور حنا بھی آ گئیں۔ شبنم دل نے بالوں میں سرخ پھول لگایا ہوا تھا۔ لباس بھی نفیس اور چست تھا۔ میں نے پھول کی خوشبو لینے کے لیے لمبی سانس لی۔ ساتھ ہی حنا پر ایک شعر پڑھا۔ اتنے میں ہما آ گئی۔ اس کے دوپٹے پر قوس قزح بنی ہوئی تھی۔ ایک مصرعہ دوپٹے پر بھی کہا۔ اجو بھلا کہاں چوکنے والی تھی کہنے لگی "ہائے کچھ پتہ بھی

توچلیے۔ کبھی پھول پسند ہے کبھی دوپٹے کی قوسِ قزح" میں نے بمشکل مسکراہٹ پر قابو پایا۔ ایک دن میں صبح جلد کلاس روم میں پہنچ گیا۔ ہما اکیلی بیٹھی جی۔ ایچ۔ لارنس کا شہرۂ آفاق ناول" لیڈی چیٹرلیز لور" پڑھ رہی تھی۔ اسے جب بھی ذرا فرصت میسر آتی کوئی نہ کوئی کتاب پڑھتی رہتی۔ کبھی آسکر وائلڈ کا مطالعہ ہو رہا ہے اور کبھی موپساں یا ٹالسٹائی کو تختۂ مشق بنایا جا رہا ہے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اسے متوجہ کرنا چاہا۔ اس کے خاموش وقار نے میرے تحت الشعور میں ایک جھجک سی پیدا کر دی تھی۔ گرمیوں کے دن تھے۔ پنکھے کا سوچ ادھر تھا۔ میں نے کہا" بھئی کوئی پنکھا چلا دے۔ گرمی سے دم نکلا جا رہا ہے۔" مگر جواب ندارد۔ میں نے سکوت کو پھر توڑنا چاہا مجھ غریب پر جو رحم کرے گا۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ یہ خیریت ہوئی کہ وہ پنجے جھاڑ کر پیچھے نہیں پڑی۔ ایسے ہی چپ چاپ بیٹھی رہی جیسے رات کی تنہائی میں کبوتر بلی کو دیکھ کر۔ آخر نوید آئی تو پنکھا چلا۔

جب سے نوید سے میری صلح ہوئی تھی۔ ہم بہت بے تکلف ہو گئے تھے اور اس میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا۔ نوید کوئی خوبصورت لڑکی نہیں تھی۔ وہ اپنے موٹے ہونٹوں پر سرخی کی شوخ تہہ جمالیتی۔ یہ سرخی اس کے ہونٹوں کے فربہ پن کو اور بھی نمایاں کر دیتی۔ مجھے اس کی بے بسی پر بڑا ترس آتا۔ شاید اسی لیے میرا اس کے ساتھ انس بڑھتا جا رہا تھا۔ اب وہ میرے ساتھ اتنی بے تکلف ہو گئی تھی کہ آخر وہ میری بہن بن گئی۔ یہی لڑکی پچھلے سال مجھ سے اس قدر شرمایا کرتی تھی۔ کئی ماہ تک تو ہم صرف اشاروں کنایوں پر اکتفا کرتے رہے تھے۔ ایک دوسرے سے بات کرنے کی جرأت تک نہ ہوئی تھی۔ باتیں شروع ہوئیں بھی تو اس طور، مخاطب کوئی اور ہے اور بات کسی دوسرے

سے ہو رہی ہے۔ اب تو ہم نے انجانے میں کتنی ہی منزلیں طے کر لی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایک دوسرے سے روٹھ جاتے پھر آپ ہی آپ صلح کر لیتے۔ کسی دن ہم میں سے کوئی غیر حاضر رہتا تو طبیعت بڑی بے چین رہتی۔ اور جب ہم ملتے تو ایک دوسرے کو خوب ستاتے۔ اجو جب بھی میری ٹانگ کھینچنے کی کوشش کرتی۔ نوید کہتی "تمہارا بھائی ہے کچھ تو لحاظ رکھو" اس سے پہلے کہ اجو کوئی جواب دے میں جھٹ بول اٹھتا "سوتیلی بہن ہے" اور وہ شرمندہ سی ہو جاتی۔

ایک دن اجو نے مجھ سے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔ "آپ سچ مچ ہما سے محبت کرتے ہیں۔" اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا نوید کو شرارت سوجھی کہنے لگی " اچھی بہن ہو۔ کچھ مدد تو کرتی نہیں ہو۔" میں نے کہا سوتیلی بہن ہے نا۔ لیکن آج وہ اپنی بات کو راہ میں چھوڑنا نہ چاہتی تھی۔ اجو پھر اسی موضوع پر آ گئی۔ "سچ بتائیے آپ ہما کو چاہتے ہیں؟" میں نے کہا تو اور کیا دشمن سمجھتا ہوں۔" وہ کہنے لگی "آپ بڑے چالاک ہیں۔" میں نے کہا۔ "تمہارا بھائی جو ہوں، بہن کا اثر تو پڑنا ہی تھا۔" نوید ہنسنے لگی اجو یہ تمہارے قابو نہیں آئینگے۔ اجو کہنے لگی تو تو قابو کر لے۔ نوید جھینپ گئی۔ میں نے اجو سے نوید کی جان چھڑانے کے لیے جلدی سے کہا۔

"میں یقین تو دلا رہا ہوں آپ مانتی ہی نہیں۔ میں جیسے جیسے یقین دلاتا رہا وہ اسے محض مذاق سمجھتیں رہیں۔ اور ہما تھی کہ خود پسندی کا شکار اپنے بت بنا بنا کر اپنے آپ کو آپ ہی پوجتی رہتی۔ اپنے بت بنا بنا کر خود ہی سجدے کرتی۔ وہ میرے لیے ایک معمہ تھی۔ نہ تو اس کے چہرے پر محبت کی شفق پھوٹتی نہ نفرت کی بدلیاں دکھائی دیتی تھیں۔ کچھ اس کی خوبصورتی کی وجہ سے کچھ اس کے انوکھے انداز کی وجہ سے اسے

اور بھی بہت لڑکے چاہنے لگے تھے۔ ایک دن مجھے جو شرارت سوجھی تو میں نے بورڈ پر یہ شعر لکھ دیا۔

لاکھوں دل لے کے وہ روانہ ہوئے
خاصہ چھکڑا ہے دلربا کیا ہے

پروفیسر صاحب تشریف لائے تو شعر ان کی تیز نگاہوں کی زد میں تھا۔ انہوں نے پہلے شعر پڑھا۔ پھر کلاس پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ سب متین اور سنجیدہ صورت بنے بیٹھے تھے۔ میں دل ہی دل میں ڈر رہا تھا کہ ابھی کوئی میرا نام لے دے گا اور میری شامت آجائے گی۔ مگر خیر گزری۔ انہوں نے پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ ایک دفعہ پہلے بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ یہ پریویس ایر کی بات تھی۔ اس وقت اجو مجھ سے بہت شرمایا کرتی تھی۔ ہماری باتیں اشاروں میں ہی ہوتی تھیں۔ اس دن بھی بلیک بورڈ پر لکھ دیا گیا تھا۔

معشوق تو اچھا ہے پر مجھ سے قوی ہے
میں سوچ رہا ہوں کہ اسے چاہوں کہ نہ چاہوں

اجو بہت خوبصورت تھی اور فربہ اندام بھی بہت تھی۔ سب لڑکیاں اس مذاق پر بہت محفوظ ہوئیں۔ لیکن اب تو ہم بہن بھائی بن چکے تھے۔ سوتیلے ہی سہی اور اب وہ مجھے پہلے سے بھی زیادہ پیاری لگتی تھی۔ میں نے اجو کی طرف دیکھا۔ وہ میری طرف متوجہ نہیں تھی۔ میں بھی لیکچر سننے لگا۔ ڈاکٹر صاحب آج کہیں سے ریڈی میڈ لیکچر اٹھا لائے تھے۔ کبھی تنوع میں فرق آجاتا۔ کبھی کسی پہلو میں جھول نظر آنے لگتا۔ کبھی سرے سے مضمون ہی غائب ہو جاتا۔ کبھی کسی فقرے کی چول ڈھیلی ہو جاتی۔ ڈاکٹر صاحب کٹی پتنگ کی طرح پانسے مار رہے تھے۔ اس پر بھی ہم نے توجہ نہ ہٹانا چاہی۔ جب ڈاکٹر صاحب زیادہ بدکنے لگے تو میرے کان کھڑے ہوئے۔ آخر انہوں نے

تنگ آکر لیکچر بند کر دیا اور ذرا تیز لہجے میں بولے "کیا ہے ؟ آپ پندرہ منٹ سے یونہی کر رہی ہیں۔ ساری کلاس کی نظریں پردے کے اس پار گھوم گئیں۔ میں نے دیکھا اجو بار بار پہلو بدل رہی تھی۔ اجو کا رنگ اڑ گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی سرزنش پر وہ بھیگی بلی بن گئی تھی۔ وہ دبکی ہوئی آہستہ سے دبے لہجہ میں کہنے لگی۔ "جی پنسل" میں نے دیکھا پنسل چکر کھاتی ہوئی ڈاکٹر صاحب کے پاؤں میں پہنچ چکی تھی۔ ہنسی سے میرا برا حال ہو گیا۔

نوید اور اجو میں گہری چھنتی تھی۔ دونوں بہت بے تکلف تھیں۔ ایک دن چھیڑ چھاڑ میں ان سے کانچ کا گلاس ٹوٹ گیا۔ رمضان آ گیا تھا اور پانی پینے کے لیے لائبریری بہترین جگہ تھی۔ اجو کہنے لگی گلاس لا دیجیے۔ میں نے گلاس منگوا دیا۔ لائبریرین کہنے لگا۔ میں نے نیا گلاس منگوا لیا ہے۔ اجو اور نوید مجھے کہنے لگیں آپ اپنا گلاس واپس لے جائیں۔ میں نے کہا۔ یہ واپس ہونے کے لیے نہیں آیا تھا۔ چند دن یہی جھگڑا رہا۔ بڑے بڑے مکالمے بولے جاتے رہے۔ کوئی بھی تو نہ ہار مانتا تھا۔ کہنے لگیں ہم گھر بھی نہیں لیجا سکتیں۔ گھر والوں کے استفسار پر کیا جواب دیں گی۔ لائبریرین کہتا میرے سر سے یہ بوجھ اٹھوا دو۔ یہ گلاس میں یہاں نہیں رکھ سکتا۔ بس دیکھنا چاہتا تھا دیکھیں اس ضد میں جیت کس کی ہوتی ہے۔ مجھے بھی تو اجو اور نوید پہ مان تھا۔ اتنے دن لائبریرین بھی کتب کا غلط اندراج ہی کرتا رہا۔ اس کا ذہن کباڑ خانہ بن گیا تھا۔ اس کے چہرے کی زردی میں چمک آنے لگی تھی۔ وہ روزہ باقاعدہ رکھتا تھا۔ روزے کے تقدس کی تہہ کے نیچے بھی رومان کی جھلک نظر آ جاتی تھی جو اس کے دل کی کسی تہہ میں چھپی ہوئی تھی۔ آخر جیت اسی کی ہوئی۔ اسے اجازت مل

گئی تھی اور اس نے وہ گلاس توڑ دیا تھا۔ وہ اپنے افسانے کے لیے مواد اکٹھا کرنے لگا۔ وہ ہر سال ـ ـ ـ میگزین کے لیے ایک افسانہ تیار کیا کرتا تھا۔ مگر بدقسمتی سے اس کا ہر افسانہ ناقابلِ اشاعت والی فائل میں چلا جاتا تھا۔ اب کی اس نے ایک نیا افسانہ لکھا۔ عنوان تھا " اور گلاس ٹوٹ گیا۔"

---

(۳)

ہمارا فائنل ایر تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا پرانا ناقوس حسب سابق فراز کوہ سے
بج رہا تھا کہ امتحان قریب آ رہا ہے۔ " ہوشیار۔ ہوشیار " لیکن شرارتوں میں کوئی
کمی ہونے ہی میں نہ آتی تھی۔ یار لوگ ٹس سے مس نہ ہوتے۔ لیکن میں یہ محسوس ضرور
کرتا تھا کہ یہ سب بنتے ہیں۔ کلاس میں آکر خوب ہنگامہ کرتے ہیں اور گھر جا کر خوب
پڑھتے ہیں...... اتنے اونچے نمبر یونہی تو نہیں مل جاتے تھے۔ میں بھی
متانت کا غلاف چڑھانے کی کوشش میں تھا۔ گھر پہنچ کر پڑھنے کی کوشش کرتا۔
مگر ذہن تھا کہ شگوفوں سے اٹا پڑا تھا۔ میں چاہتا تھا کچھ دیر کے لیے یہ مرجھا جائیں۔
میں بھی دوسرے لڑکوں کی طرح جھوٹ بول سکوں اور کہوں کہ حضت پڑھنا اوڑھنا
کہاں۔ میں تو کل سینما گیا ہوا تھا۔ پچھلے چند دنوں میں میں نے کوشش بھی کی تھی مگر
یاد کرتے وقت ہر سوال کا جواب ذہن کے الم غلم کے نیچے دب جاتا تھا " ان باتوں
کے باوجود میں سنجیدگی کو چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھا۔ مطالعہ کرنا چاہتا تھا مگر کر نہ

سکتا تھا۔

ایک دن میں بڑے موڈ میں بیٹھا تھا۔ میرا ایک دوست آگیا۔ یہ لیگ کا ممبر تھا۔ اور لیگ ایک عظیم مشاعرہ کرا رہی تھی کہنے لگا تم بڑے منتظم ہو۔ اسٹیج کا کام سنبھالو۔ میں نے امتحان کی منطق پیش کی۔ کہنے لگا تمہیں جانا پڑے گا۔ جب فرار کی کوئی گنجائش نہ رہی اور میرے منطقی دلائل سرنگوں ہو گئے تو آمادہ ہو گیا۔ میری شیو بڑھی ہوئی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میں نے سوچا کم از کم ایک گھنٹہ شیو کرنے اور نیئے سرے سے میک اپ کرنے میں لگے گا۔ شریف آدمیوں کی طرح بیٹھ کر پڑھنا چاہیے۔ میں نے دوسرے ہی لمحہ ارادہ بدل لیا۔ جتنا وقت مشاعرے میں ضائع ہو گا۔ اس کی کسر ابھی نکال لینا چاہیے۔ مشاعرہ سننے کو جی بھی للچا رہا تھا۔ میں نے کتاب کو الٹا پلٹا۔ پھر دوسری کتاب اٹھائی۔ اس میں بھی دل نہ لگا تو کتابوں کی ترتیب درست کرنے لگا۔ شام ہو گئی۔ پڑھ بھی نہیں رہا تھا۔ کیوں نہ شیو کر لی جائے۔ بہت سے لوگ آئے ہونگے۔ ہر وقت نفیس طبع بنے رہنا اور ایسے وقت پر کور ذوق بننا۔ میں نے شیو کی۔ بہترین سوٹ پہنا، بن ٹھن کر بقول فنا قتل عام کا سامان پیدا کر کے مشاعرے کا رخ کیا۔ اب تک میری جانے اور نہ جانے کی کشمکش ختم ہو چکی تھی۔ اور میں ایک فیصلہ پر پہنچ چکا تھا۔ ابھی لوگ آنا شروع نہیں ہوئے تھے۔ میرے دوست نے ایک خوبصورت سا لیگ کا بیج میرے کندھے پر بھی لگا دیا۔

میں ایک احمقانہ تفاخر سے اپنی دانست میں اشوک کمار بنا ہوا تھا۔ اسٹیج کے علاوہ سو روپے کے ٹکٹوں والی جگہ بھی میرے سپرد تھی۔ میں بڑا منتظم نظر آرہا تھا۔

میں سگریٹ نہیں پیتا تھا۔ ویسے مجھے پینا آتا تھا۔ دوست کو کہا بھئی پان اور سگریٹ منگواؤ۔ اس نے مجھے پورا ہیرو بنا دیا۔ پان کھانے کے بعد سگریٹ انگلیوں میں دبا کے میں اپنے آپ کو اور بھی خوبصورت سمجھنے لگا۔ شاعروں کا استقبال ہو رہا تھا۔ کوئی بیٹھے ہوئے لوگوں کو نظرانداز کر کے بے نیازی سے اسٹیج کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کوئی جھومتا جھامتا آرہا تھا۔ کوئی بال بکھر لکے۔ داڑھی کے بال الجھے۔ آنکھیں موندے لڑکھڑاتا آرہا تھا۔ اس حالت میں جناب والا کو کوئی بچہ دیکھ لے تو شاید ریچھ سمجھ کر ڈر جائے۔ وہ لوگ کسی کی رائے سے بے نیاز اپنے مخصوص موڈ میں تھے۔ ان کو کیا، کوئی کیا کہتا ہے۔ کسی شاعر کے دانتوں کی بجائے صرف پان کا رنگ نظر آرہا ہے۔ اور میں سب کا مسکراہٹوں سے استقبال کر رہا تھا۔

سو روپے والی سیٹوں پر بڑے بڑے لوگ بیٹھے تھے۔ بعض وضع دار تھے اور اپنے روائتی لباس میں نظر آرہے تھے۔ کچھ شیروانی پہنے پان چبا رہے تھے۔ یہ جگہ تو کسی فلم کا سین معلوم ہوتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے آج عورتوں نے رنگوں کا انتخاب کرتے وقت اپنے ذہن کی تمام قوتیں صرف کر دی ہوں اور مثال قائم کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا ہو۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ مقابلے میں ایک دوسری کو شکست دینا چاہتی ہوں۔ طرح طرح کے عطر دماغ کو معطر کر رہے تھے۔ کچھ لڑکیاں سوئیٹر بن رہی تھیں۔ جیسے سوئیٹر بھی ایک شعر ہو۔ لباس میں سرسراہٹ تھی۔ جسم کے زاویے نمایاں تھے۔ نظر نظر پیام تھا۔ جی خوش ہو گیا۔ میں دنیا و مافیہا سے بے خبر اس ماحول میں گم ہونے لگتا تو کوئی خوبصورت جوڑا، کوئی البیلی آجاتی تھی۔ میں پھر حسن کی قوسِ قزح کی طرف متوجہ ہوتا اور فوراً ان کا خیر مقدم کرتا۔

اس حسنِ بے پناہ کے باوجود میرا ذہن ڈیوٹی کے احساس سے خالی نہ تھا۔ تین لڑکیاں اپنی پچاس روپے والی سیٹیں چھوڑ کر سو روپے والی جگہ پر بیٹھنے لگیں۔ بڑی

خوبصورت لڑکیاں تھیں۔ لباس کی نفاست ان کے اعلیٰ ذوق کا پتہ دیتی تھی۔ میں نے ایک نظر ان کے مسحور کر دینے والے حسن کو دیکھا، میں بیخود سا ہو گیا۔ پھر مجھے خیال آیا او ہو میں تو ہیرو بن رہا ہوں۔ مجھے اپنے فرضِ منصبی کی ادائیگی یاد آ گئی۔ جی تو چاہتا تھا ان کو اسٹیج پر لا بٹھاؤں مگر بچارا فرضِ منصبی۔ ان سے معذرت چاہی۔ معاف کیجئے یہ سیٹیں...

..... وہ مسکرا کر اٹھ بیٹھی تھیں۔ بالکل اس انداز سے جیسے انہوں نے شرارت سے ایسا کیا تھا۔ موقعہ کھو دینے کے بعد مجھے کفِ افسوس ملنا پڑا۔ ایسی خوبصورت لڑکیوں کو کیوں اٹھا دیا۔ ان کو تو دل کے اسٹیج پر جگہ دینا چاہئیے تھی۔ یہ بھی بھلا کوئی اٹھانے کی چیز تھیں! ان کو دیکھ کر ہی دل عطر بیز ہو جاتا تھا۔ ہال فل ہو چکا تھا۔ سو روپے والی صرف تین سیٹیں خالی رہ گئی تھیں۔ بڑھتے ہوئے ہجوم اور مشاعرہ شروع ہونے میں توقف کو دیکھ کر یہ خطرہ پیدا ہو رہا تھا کہ کہیں کرسیوں کے بم نہ بنا لیے جائیں۔ مجھے لیگ کے ایک بڑے رکن نے کہا، بکنگ آفس میں جا کر ٹکٹیں بند کروا دیں۔ میں نے ٹکٹیں بند کروا دیں۔ ابھی تک باہر ایک بڑا ہجوم کھڑا تھا۔ مشاعرہ چند منٹوں میں شروع ہونے والا تھا۔

میری نظر اوپر گیلری کی طرف گئی۔ وہاں اچو اور نوید بھی منتظم بنی کھڑی تھیں۔ طالبات کے لیے خاص رعایت تھی۔ ان کو اوپر جگہ دی گئی تھی۔ ان سب نے آج دوپہر دو دو روپے میں ٹکٹ خریدے تھے! اوپر بیٹھنے والی دوسری عورتوں کو یہی ٹکٹ پانچ روپے میں ملا تھا۔ میرے کچھ کلاس فیلو نچلے درجوں کے منتظم تھے۔ اور باقی بہت پیچھے کھڑے تھے۔ میں نے بعض دوستوں کے لیے کوئی نہ کوئی اچھی جگہ بنا دی۔ کچھ معزز لوگوں کو آگے لے آیا۔ کسی کو اسٹیج کے پیچھے کھڑا کر دیا۔ ہمارے ڈاکٹر صاحب بڑے تنقید نگار تھے۔ اسٹیج پر جو تھی رو میں بیٹھے تھے۔ میں نے اپنے شاگردانہ حقوق کے پیش نظر ان کو اٹھا کر سب سے اگلی

رو میں بٹھانا چاہا۔ مگر وہ نہ مانے۔

سب طرف سے فارغ ہو کر میں نے اوپر جھانکا۔ اجو اور نوید نے اپنا اپنا انتظام ٹھیک کر لیا تھا۔ انہوں نے پچھلے دروازے بند کر دیئے تھے۔ نوید سے میری نظریں ملیں تو اس نے دروازے کی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ لیکن میں سمجھا شاید اوپر بلایا ہے۔ کوئی پرابلم آپڑی ہوگی۔ میں گیٹ پر پہنچا تو کہنے لگی ہم نیچے آجائیں؟ جگہ مل جائے گی؟" میں نے کہا آجایئے۔ کہنے لگی میرے ساتھ میری بہن بھی ہے۔ اجو بھی آنا چاہتی تھی۔ میں نے کہا آجایئے اور وہ دوسرے ہی لمحہ ان کو بھی لے آئی۔ میں نے ان تینوں کو ان سیٹوں پر بٹھا دیا۔ جن پر سے چند منٹ پہلے تین حسین لڑکیوں کو اٹھایا گیا تھا۔ اور شاید یہ سارا تماشہ اجو، نوید اور اس کی بہن دیکھ چکی تھیں۔ مشاعرہ شروع ہونے والا تھا۔ ہال کھچا کھچ بھرا تھا، کچھ لوگ سب سے پیچھے کھڑے یہ سارا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ میں اپنے لیے جگہ ڈھونڈنے لگا مگر کوئی جگہ نہیں تھی۔ باہر نکل کر کرسی ڈھونڈنے لگا۔ کچھ واقف نظر آگئے، ایک تو میرے دوست کا بڑا بھائی تھا۔ میں نے انہیں اسٹیج کے پچھلی طرف ایک کونے میں کھڑا کر دیا۔ لیگ کے ایک بڑے رکن نے میری طرف دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو "بغیر ٹکٹ؟" لیکن میں اپنی کرسی ڈھونڈنے میں مصروف رہا۔ بڑی مشکل سے ایک کرسی باہر سے اٹھا کر لایا۔ ایک شاعر صاحب آگئے۔ نیازمندی سے آفر کر دی۔

مشاعرہ شروع ہو گیا۔ میں کھڑا ہو کر سننے لگا۔ کچھ دیر بعد دو شاعر اور آگئے۔ ان کا انتظام کیا۔ پھر کچھ وقفہ کے بعد ایک شاعر اور آگیا اس کے لیے بھی کرسی ڈھونڈی۔ اب باہر والے برآمدے میں بھی کوئی کرسی نہیں تھی۔ میں اسٹیج پر سادھوؤں کا سا آسن جمائے بیٹھ گیا۔ میرے پیچھے ایک بہت مشہور شاعر مع اپنے عجیب و غریب حلیے کے بیٹھے پان

چبا رہے تھے۔ جن کے پان بھرے منہ کا مجھے ہر لمحہ کھٹکا لگا رہا کہ ابھی پان کی چھینٹیں میرے خوبصورت کوٹ پر حسین گلکاری کریں گی۔ ان کے ساتھ ہی ایک خوبرو شاعرہ بیٹھی تھی۔ یہ بڑے ترنم کے ساتھ اشعار پڑھتی تھی۔ جوان بھی تھی، اور شکیل ہونے کے ساتھ ساتھ دلربایانہ ادائیں بھی تھیں۔ ترنم بھی قیامت کا۔ میں اس کی طرف کنکھیوں سے دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک شاعر نے مجھے کہا، چائے پینا چاہتا ہوں۔ اتنے میں ہال کے آخر میں ہنگامہ سا ہوا۔ میں نے تیکھی تیکھی نظروں سے ان کو دیکھا جیسے اُن کو کھا ہی تو جاؤں گا۔ شاید میرے منتظم ہونے پر یہ ایک چوٹ تھی۔ ناچار اٹھا چائے کا انتظام کیا۔ ایک چکر پیچھے لگا کر آیا۔ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ پریس فوٹو گرافر نے مشہور شاعر اور شاعرہ صاحبہ کا فوٹو لے لیا۔ میں بھی ان کے قدموں میں آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ یہ تماشہ ختم ہوا تو نوید نے مجھے بلا لیا۔

نوید کو پیاس لگی تھی۔ برف ختم ہو چکی تھی۔ میں نے کہا تھوڑا انتظار کیجیے۔ انہوں نے چند لمحوں کے بعد پھر کہا گرم ہی پلا دیجیے۔ میں برآمدے سے دو گلاس بھر لایا۔ ایک اچو کو اور دوسرا نوید کو پکڑا دیا۔ انہوں نے دو دو گھونٹ پیئے اور گلاس چھوڑ دیئے۔ نوید کی بہن کہنے لگی مجھے دے دو اور اس نے سارا گلاس خالی کر دیا۔ میں دونوں گلاس لے کر واپس آ گیا۔ کچھ دیر بعد ایک اور صاحبہ نے پانی مانگا۔ میں گلاس بھر کے لے گیا۔ میری یہ حرکت دیکھ کر میرے ایک کلاس فیلو جو پچھلی سیٹوں کے منتظم تھے آئے۔ کان میں آہستہ سے کہنے لگے پانی پلانے کے لیے بابا جو ہے۔ جس بات کو وہ میری بیوقوفی سمجھے تھے اسی بات میں تو مجھے خوشی محسوس ہو رہی تھی۔

اب ان شاعر صاحب کی باری آ چکی تھی جو میرے ساتھ الیکشن لڑے تھے۔ بڑے

ترنم سے پڑھتے تھے ۔شعر بھی کچھ بُرے نہیں ہوتے تھے ۔ گلا بڑا اچھا تھا۔ ابھی وہ غزل ختم نہ کرنے پائے تھے کہ نوید نے مجھے بلایا اور ایک پرانی غزل کے لیے کہا۔ مجھے یاد آیا ایک دن ایک رسالے سے نوید وہ غزل چھپے چوری پھاڑ کر لے گئی تھی ۔ مجھے ایک ایک کر کے نوید کی ہر حرکت یاد آنے لگی ۔ اس نے ووٹ تو اسی کو دیا تھا ۔ میرے ساتھ اُنسیت کے باوجود شاید وہ دل ہی دل میں اسے پوجتی تھی ۔خیر میں اسٹیج پر چلا گیا اور اس کے کان میں جا کر کہا بھئی فرمائش پوری کرو۔ جب دوسری مرتبہ اس کی باری آئی تو مائیک کے سامنے کھڑے ہوتے ہی وہ ترنم کی پہلی لَے میں ہی دھر لیا گیا۔ سامعین کرام سے معذرت چاہنے لگا ۔ کہنے لگا مجھ سے غزل نہیں پڑھی جائے گی۔ حاضرین نے شور مچا دیا ضرور پڑھیئے ۔ مگر اس کے دل میں جو گھوڑ دوڑ شروع ہو گئی تھی اس کو حاضرین بھلا کیسے سمجھ سکتے تھے ۔ نوید کی فرمائش نے اسے بے بس کر دیا تھا ۔

نوید نے مجھ سے ۔ ۔ ۔ ۔ کاغذ منگوائے اور کچھ شعر نوٹ کرتی رہی ۔ میں نے اچٹتی سی نگاہ ڈالی تو میں نے دیکھا کہ نوید کی بہن نوید سے کچھ زیادہ ہی خوبصورت تھی ۔ بالوں کو نیا سنوار کر سر کی پشت پر ایک دائرے کی شکل میں لپیٹ دیا گیا تھا ۔ اس کے ہونٹ بھی نوید سے پتلے تھے ۔ قد چھوٹا جسم بھر بھرا تھا۔ لباس بڑا نفیس تھا ۔ مجھے یاد آیا اس لڑکی کو میں نے پہلے کبھی دو ایک مرتبہ کالج میں دیکھا تھا ۔ نوید سے دو ایک سال بڑی ہو گی۔

مشاعرہ ختم ہوا تو نوید کہنے لگی اتنی رات گزر گئی ہے ہمیں تو اس سناٹے اور ویران راہوں سے ڈر لگتا ہے ۔ آپ ہمیں گھر تک چھوڑ آئیں ۔ میں نے کہا دو ایک ۔ ۔ ۔ ۔ منٹ انتظار کریں ۔ یہ کہنے کے بعد میں خاص خاص آدمیوں سے الوداعی ملاقات کرنے لگا ۔ چند لمحوں بعد جو پیچھے دیکھتا ہوں تو وہ سب غائب ہیں ۔ مجھے نیند

آرہی تھی۔ تھک بھی بہت گیا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ گھر جانے لگا تو میرے حریف شاعر نے مجھے آ دبوچا "چلو" میں نے کہا کدھر؟ کہنے لگا "جدھر وہ گئی ہیں" لیکن وہ تو جا چکی تھیں۔ اس نے مجھے کھینچتے ہوئے بہت سے لوگوں میں اشارہ کیا۔ "وہ دیکھو وہ جا رہی ہیں۔" ان کے ساتھ لائبریرین بھی تھا۔ ہمارے ساتھ ایک اور مشہور شاعر آملا۔ اس کا گھر راستے میں تھا۔ ہم تینوں آگے آگے چلتے رہے اور وہ چاروں ہمارے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ میں خلاف معمول سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگا رہا تھا۔ ایک جگہ پر ہم ٹھہر گئے۔ ہمارا ساتھی شاعر اپنے مکان کی سیڑھیاں چڑھ گیا۔ وہ چاروں اس کے مکان کے بالکل عین سامنے موڑ کی طرف مڑ گئے۔ ہم دونوں وہاں سے واپس آ گئے۔ مجھے سخت نیند آ رہی تھی۔ لیٹتے ہی سو گیا۔

○

بہت جلد صبح ہو گئی۔

آنکھیں اب بھی بوجھل بوجھل سی تھیں۔ تھکاوٹ ابھی تک دور نہ ہوئی تھی۔ طبیعت پر شاعرانہ کیفیت چھائی ہوئی تھی میں یوں بے زاری سے اٹھا جیسے کوئی رنگین خواب ٹوٹ گیا ہو۔ جلد جلد تیار ہوا۔ لیکچر شروع ہونے میں چند منٹ ہی باقی تھے۔ آجکل بڑے ضروری قسم کے لیکچر ہو رہے تھے۔ میں گھبراہٹ سے تیز تیز قدم اٹھاتا جا رہا تھا کہ سیڑھیوں کے قریب برآمدے میں نوید مل گئی۔ مسکراتے ہوئے کہنے لگی "شکریہ" میں نے پوچھا کس بات کا؟ کہنے لگی رات آپ ہمیں چھوڑنے جو آئے تھے۔ میں نے سوچا مجھے تو وہ شاعر کا بچہ گھسیٹ کر لے گیا تھا۔ میں تو ان کو چھوڑنے کی غرض سے گیا ہی نہ تھا۔

میں شرمساری سے بچنے کے لیے آگے بڑھنے لگا تو کہنے لگی "میری بہن نے بھی آپ کا شکریہ ادا کیا ہے" اور میں بغیر کوئی بات ذہن میں لائے مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ کلاس روم خالی پڑا تھا۔ مجھے کھڑے کھڑے خیال آیا۔ ارے میاں تم عجیب گھامڑ ہو۔ کم از کم شکریہ کا جواب تو دیا ہوتا۔ مجھے اس بات پر کوفت نہیں ہونے لگی کہ میں اچھا حاضر جواب نہیں ہوں۔ میں الٹے پاؤں آیا۔ سیڑھیوں میں مجھے پھر نوید مل گئی۔ میں نے کہا میرا بھی شکریہ ادا کر دیجیے گا۔ کہنے لگی "میں تو نہیں کروں گی" مجھے ذرا غصہ آنے لگا لیکن میں نے مسکراتے ہوئے کہا "آپ نے اُن کا شکریہ ادا کیا ہے تو میرا بھی کر دیں"۔ کہنے لگی "آپ خود کر لیں"۔ میں نے کہا "میں کیسے کر سکتا ہوں"۔ کہنے لگی آپ اس کے ہسپتال چلے آئیے گا۔ اس نے مجھے پتہ نوٹ کروا دیا۔ میں نے نوٹ بک بند کرتے ہوئے کہا اچھا تو مجھے خود ہی جانا پڑے گا؟ کیا ہرج ہے"؟

"ہاں کوئی خاص نہیں"، اور وہ مسکراتی ہوئی اوپر چلی گئی۔

شام ہونے میں ابھی بہت وقت پڑا تھا مگر دوپہر کب کی ڈھل چکی تھی۔ میں نے نئے سرے سے میک اپ کیا اور اپنی نئی منزل کی طرف بڑھنے لگا قریب پہنچ کر ایک دوکاندار سے پوچھا اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ کچھ آگے بڑھ کر ایک پانفروش سے پوچھا۔ اس نے معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھا۔ کہنے لگا پچاس گز کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی گلی آئے گی۔ گلی کی نکڑ پر پہنچ کر آپ پوچھ لیجئے گا۔ میں نے ایک بک بائینڈر سے پوچھا۔ اس نے سر سے پاؤں تک مجھے دیکھا۔ پھر کچھ سوچتا رہا۔ میں نے گرد و پیش دیکھا کوئی ہسپتال نظر نہ آیا۔ میں نے پھر استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنے شاگرد کو کہا۔ "پروفیسر کے پاس چھوڑ آؤ"۔ اس نے مجھے ایک دکان

دکھائی۔ جو کبھی کسی لوہار کی ہو گی۔ مگر اب تو کام بند پڑے عرصہ گزر چکا تھا۔ لوہے کے زنگ آلود، نامکمل اور ناکارہ کچھ اوزار پڑے تھے۔ وہاں ایک شخص زمین پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ جسم کا انجر پنجر مل چکا تھا۔ مجھے پوچھنے لگا آپ کہاں سے آئے ہیں۔ میں نے بتایا یونیورسٹی سے آیا ہوں۔ کہنے لگا آپ نے کسی سے ملنا ہے؟ میں نے کہا ڈاکٹر مینا سے، کہنے لگے "مینا سے یا نوید سے؟" میں نے کہا مینا سے ۔۔۔ کچھ دیر سوچتے رہے۔ پھر کہنے لگے آپ نے میرا نام اخباروں میں پڑھا ہو گا۔ میں پروفیسر ہوں۔ میں نے بڑے بڑے قیمتی مضامین لکھے ہیں۔ بڑی ریسرچ کی ہے۔ آپ نے پڑھے تو ہونگے؟ میں سوچ رہا تھا کیا جواب دوں۔ اتنے میں ایک شخص اور آ گیا۔ اس نے گاڑھے کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اس نے پروفیسر صاحب سے کوئی پرانا اوزار خریدا۔ وہ اس کے ساتھ کوئی الف لیلیٰ کا قصہ چھیڑ بیٹھے۔ میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا جلدی سے شکریہ ادا کر کے چلتا بنوں۔ نوید نے کہا تھا ہسپتال اور گھر ایک دوسرے میں مدغم ہیں۔ مجھے یہ بھی خدشہ تھا کہ کہیں اس کا کوئی عزیز آ گیا تو کچھ اور ہی نہ سمجھ بیٹھے۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گزر چکا تھا۔ میں ایک بوسیدہ سی کرسی پر کتنی ہی مرتبہ بے چینی سے پہلو بدل چکا تھا۔ میں نے سوچا میری سٹیل کلر پینٹ کو ہپ پر ضرور زنگ لگ گیا ہو گا۔ میری بے چینی دیکھ کر پروفیسر کے لیکچر کو قطع کرتے ہوئے اس کے ساتھی نے کہا ان کو آپ چھوڑ آتے تو اچھا تھا۔ وہ دونوں پرانے دوست معلوم ہوتے تھے۔ اس نے مجھے ایک مرتبہ پھر پوچھا "آپ نے نوید سے ملنا ہے یا مینو سے؟" میں نے آہستہ سے کہا "مینو سے" وہ پھر مراقبے میں چلا گیا۔ اس کے دوست نے موقعہ کو غنیمت جانا اور آہستہ سے کھسک گیا۔ کچھ دیر بعد انہوں نے مراقبے سے سر اٹھایا سلیپر پہنے اور میرے آگے آگے

چلنے لگے۔ اسی بُک بائنڈر کی دکان کے عین سامنے ایک چھوٹا سا بورڈ لگا تھا۔ ٹوٹی ہوئی قبروں جیسی چھوٹی چھوٹی اندھیرے میں گم سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں۔ مکان بہت پرانا اور بوسیدہ معلوم ہوتا تھا۔ اسی عمارت میں مینا کا پرائیویٹ ہسپتال تھا۔

آخری سیڑھی پر پہنچنے سے پہلے انہوں نے آواز دی "مینو" مینو باہر آئی۔ مجھے دیکھ کر مسکرا دی۔ کہنے لگی آ جائیے۔ ..... پروفیسر واپس چلا گیا۔ میں اس کے کمرہ میں بیٹھ گیا۔ اس نے نفیس سے ریشمی کپڑے پہن رکھے تھے۔ دوپٹہ نیچے سرک گیا تھا اور بالوں کا گول جوڑا ننگا ہو رہا تھا۔ وہ اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ غسل خانہ سے بھی چھوٹا۔ مسکراتے ہوئے کہنے لگی آپ کیسے آ گئے؟ میں نے طبیعت میں ذرا ظرافت کا رنگ بھرتے ہوئے کہا۔ "راستہ پوچھ پوچھ کر۔" کہنے لگی "زیادہ دِقت تو نہیں ہوئی ؟" میں نے کہا "بالکل نہیں" پھر میں نے بتایا نوید نے آپ کا شکریہ تو مجھ تک پہنچا دیا تھا۔ لیکن مجھے کہا کہ آپ خود جا کر شکریہ ادا کریں۔ میں نہیں کہونگی۔ وہ مسکرانے لگی "تو اس نے آپ کو ناجائز تکلیف دی۔ بڑی شریر ہے۔" میں نے کہا میری سیر ہو گئی۔ ویسے بھی تو اس وقت میں ذرا رونق دیکھنے نکل آتا ہوں۔ اس کے بعد ہم دونوں خاموش ہو گئے۔ غالباً اب ہم دونوں کے پاس کوئی موضوع نہ تھا۔

اٹھنے سے پہلے میں نے نوید کے متعلق پوچھ لینا مناسب سمجھا۔ کہنے لگی بلواؤں۔ میں نے کہا ہاں۔ وہ اوپر گئی اور اسے آواز دے کر آ گئی۔ میں نے اندازہ لگایا اوپر کی منزل پر اس کی رہائش ہو گی۔ ہم دونوں بیٹھے تھے کہ نوید بھی آ گئی۔ وہ ننگے پاؤں تھی۔ لباس تو ریشمی تھا مگر اس میں سلوٹیں پڑ چکی تھی۔ نوید مینو سے کہنے لگی میں ان

کی کتنی باتیں تم سے کیا کرتی تھی۔ آج جی بھر کر ان کو اچھی طرح دیکھ لو۔ کیا بھولے بھالے بنے بیٹھے ہیں۔" وہ دونوں ہنسنے لگیں۔

اِدھر اُدھر کی گپ شپ ہوتی رہی۔ اچانک نوید نے پوچھا "آپ شادی شدہ ہیں۔" میں نے کہا۔ "اتنا گنہگار تو نہ بنایئے۔" وہ دونوں مسکرادیں۔ نوید نے کہا آپ نے شادی کیوں نہیں کی۔ میں ہنسنے لگا، کچھ ایسا جان پڑتا ہے جیسے آپ میری آزادی پر جلتی ہیں"۔ کہنے لگی آخر کرنا تو پڑے گی۔ میں نے کہا کوئی اتنا ضروری بھی تو نہیں۔ اس نے کہنی سے مینو کو ٹھوکا دیا "لوجی اور سن لو۔" میں نے کہا اگر کرنا ہی پڑی تو کوئی میم اپنے ساتھ گھسیٹ لاؤنگا۔ ویسے تو شاید نہ آئے۔" ہنسی کی ہلکی ہلکی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ میں نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا یہاں پر ایک معمولی شادی پر کم از کم دس ہزار روپیہ خرچ آتا ہے۔ یہ روپیہ میرے سمندر پار کے اخراجات کے کام آجائے گا اور بیوی مفت میں ہاتھ آجائیگی۔ "کیا خیال ہے جناب کا؟" نوید نے کہا "دیکھا کتنے سیانے ہیں، ہیر کلاس فیلو صاحب۔" کہنے لگی آپ کس سلسلے میں جا رہے ہیں۔ میں نے بتایا میں ڈاکٹریٹ کے لیے جاؤنگا مگر ابھی تو کچھ دیر کے لیے یہاں ہی ہوں۔

یہ موضوع بدلا تو ہسپتال کے سلسلے میں باتیں ہونے لگیں۔ مینو کہنے لگی پہلے تو میں فیس بھی نہیں لیتی تھی، غربا کی خدمت ہو جاتی تھی۔ اب واجب سی لے لی جاتی ہے۔ جب یہ کام شروع کیا تھا اس وقت بھائی جان زندہ تھے۔ وہ ایک حادثہ کا شکار ہو گئے تھے۔ ان سے کچھ دیر پہلے ہمارے اباجی کی موت واقعہ ہو گئی تھی۔ مجھے ان کی حالت پر بڑا ترس آیا۔ میں دل ہی دل میں افسوس کرنے لگا۔ میں نے کہا مجھے تو

علم ہی نہیں تھا۔ واقعی بہت افسوس کی بات ہے۔ مینا سوچ میں ڈوب گئی۔ نوید کے چہرہ پر پژمردگی چھاگئی تھی۔ مینا کہنے لگی ہم دو بہنیں ہیں۔ ہمارے نام چھ سات مکان ہیں۔ کچھ روپیہ بھی ہے۔ تھوڑی بہت زمین بھی ہے۔ ابا کے بعد بھائی جان نے ملازمت چھوڑکر کاروبار سنبھال لیا تھا۔ وہ بھی نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اکیلا چھوڑ گئے۔ ان کا سہارا تھا تو کبھی کسی کو جرأت نہیں ہوتی تھی کہ ہماری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے مگر اب تو لوگوں کے حوصلے اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ ہم گلی سے گزرتی ہیں تو بدمعاش ہم پر آوازے کستے ہیں۔" ان کی بے بسی پر میرا دل پسیج گیا۔ میں نے کہا اگر میں آپ کے کسی کام آسکوں تو بلاتکلف کہہ دیجئے گا۔ میرے لیے یہ باعثِ مُسرّت ہوگا۔ کہنے لگی ہمارا کوئی بھی نہیں۔ ایک بھائی ہیں ان کو پتہ نہیں کیا ہوگیا ہے۔ مجذوبانہ حالت میں رہتے ہیں۔ امی سے جتنا روپیہ لیتے ہیں پتہ نہیں کسے دے دیتے ہیں کیا کرتے ہیں۔ اب کہتے ہیں ایک مکان مجھے دے دو۔ اگر ایسا کر دیا گیا تو وہ چند دنوں میں مکان کو ختم کر دیں گے۔ میں نے کہا تو آپ کو ہرگز ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ اس طرح تو وہ بھی ضائع ہوجائے گا۔ نہ ان کا ہی کچھ بنے گا نہ آپ ہی کے کام آسکے گا۔ میری ساری ہمدردیاں ان کے ساتھ ہوگئی تھیں۔ —— اتنے میں اوپر سے ایک پلیٹ میں گول گول دائرے کی شکل میں کٹے ہوئے مالٹے آچکے تھے۔ نوید کہنے لگی کھائیے۔ میں نے انکار کر دیا۔ مینا کو کہنے لگی تمہارے مہمان ہیں تم کہو تو شاید مان جائیں۔ میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ مینا کہنے لگی نوید تم کہو تمہارے کلاس فیلو ہیں۔ اس نے پھر اصرار کیا۔ میں نے پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ اب وہ دونوں مجبور کرنے لگیں۔ میں نے کہا "نہیں" کہنے لگیں امی کیا کہے گی؟ میں نے کہا میں مالٹے

کھاتا ہی نہیں ہوں۔ وہ دونوں مجھ سے ناراض ہو گئیں۔ پھر کچھ دیر ہم تینوں خاموش بیٹھے رہے۔ میں لوہے کے کوئی چار فٹ لمبے بینچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ مینا اپنی کرسی پر تھی اور نوید میز سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ میں اٹھنے لگا تو انہوں نے روک لیا بغیر کھائے آپ نہیں جا سکتے۔ لیکن میں موڈ میں نہیں تھا۔ بہت دیر یہی بحث چلتی رہی۔

"آپ اپنی میم سے بھی ایسا ہی کیا کریں گے؟" نوید نے شوخی سے پوچھا۔ میں نے کہا "ہاں" "وہ آپ کو بہت جلد طلاق دے دے گی۔ ہم تینوں ہنسنے لگے۔ اتنے میں پروفیسر کسی کام سے آئے اور چلے گئے۔ نوید کہنے لگی۔ آپ بھائی جان کے پاس کیسے چلے گئے تھے؟ میں نے بتایا کہ سامنے کی دکان سے آپ کا پتہ پوچھا اس نے مجھے وہاں پہنچا دیا۔ نوید کہنے لگی میں نے آپ کو نوٹ جو کروا دیا تھا۔ میں خاموش رہا۔ دراصل میرے ذہن میں ایک ایسے ہسپتال کا نقشہ تھا جس کی چار دیواری ہوگی۔ میں تو یہ سوچ کر آیا تھا کہ چپراسی کو چٹ دونگا اور وہ مجھے بلوائے گی۔ لیکن معاملہ خلاف توقع بالکل الٹ نکلا۔ ہمیں یہاں بیٹھے کافی دیر ہو گئی تھی۔ شام کا اندھیرا کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ میں ان کو ناراض چھوڑ کر ہی اٹھ آیا

○

میری زندگی کا جہاز طوفانی لہروں کی زد میں تھا!!

جدائی کے قلق نے داغ دل کو اور بھی سیاہ کر دیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا جو کچھ میں نے سنا ہے کاش غلط ہو مگر اندیشہ ہائے دور دراز میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ دل کی تہہ میں یادوں کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا تھا۔ میں حالات کو شکست دینے کی کوشش

میں لگا رہا۔ مجھے کسی نے اچانک بتا دیا تھا کہ عتیق کی شادی ہو چکی ہے۔ میں ماضی کے کھنڈروں میں ٹھوکریں کھانے لگا۔ جدائی کا داغ ہی کیا کم تھا جو اتنا بڑا چرکہ اتنی شدت کے ساتھ اور آ لگا۔ دل کا آتش فشاں پھٹ پڑا۔ میں بے حد رنجیدہ اور مضمحل ہو گیا۔ عتیق شاید اسی لیے کہا کرتی تھی کہ میں مجبور ہوں۔ کاش یہ مجبوری وہ آغاز محبت سے پہلے محسوس کر لیتی۔

اڑتے ہوئے وقت کی دھول نے محبت کے جنازے کے نقش پا کو کچھ نہ کچھ دھندلا دیا تھا۔ اب پھر سے زخمِ دل ہرا ہو گیا۔ میں نے اس کا تریاق ہما کے آنچل سے چاہا۔ مگر اس کی بے رخی میرے دل کا مداوا نہ بن سکی۔ میں نے سوچا مینا کی دوستی شاید اس تازہ زخم کا مرہم بن سکے۔

ہماری یونین نے انٹر کالجیٹ مشاعرہ کروایا تھا۔ سیکرٹری نے کالجوں اور دوسرے لوگوں کو پاس بھیج دیے تھے۔ جو بچ گئے تھے وہ میرے پاس تھے۔ اچو آئی اور میرے ہاتھ سے کچھ پاس چھین کر لے گئی۔ کچھ دوسری کلاس فیلو لڑکیوں نے مانگ لیے۔ نوید کہنے لگی مجھے پندرہ بیس پاس چاہئیں۔ میں نے اپنی سہیلیوں کو دینے ہیں۔ میں نے مینا کو اس دن ناراض کر دیا تھا۔ میں نے کہا مینا کو بھی لیتی آنا۔ میرا پیغام خاص طور پر دیجئے گا۔" پھر میں بس یونہی کتنی ہی دیر سوچ میں مستغرق رہا۔ مینا کتنی مخلص ہے۔

مشاعرے کا دن آیا تو سب لوگ آئے مگر مینا نہیں آئی۔ نوید نے کوکب کو میرے پاس بھیج دیا۔ کوکب چھوٹی سی بڑی پیاری سی بچی تھی بالکل چینی کی گڑیا۔ میں اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ مگر اس خوشی کے نیچے اداسی اور بے چینی کی ایک ہلکی سی لہر بھی تھی۔ میں نے کوکب سے پوچھا مینا کہاں ہے؟ اس نے مجھے بتایا وہ گھر پر ہے۔ کوکب

اس کی بھانجی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم دونوں اتنے مانوس ہو گئے کہ میں اسے اپنے سے ایک منٹ کے لیے بھی الگ نہ کرنا چاہتا تھا لیکن نوید نہ مانی اور کوکب کو اپنے ساتھ لے گئی۔

مجھے معلوم تھا مینا مجھ سے ناراض ہوگئی ہے۔ میں نے دانستہ طور پر چپ سادھ لی تھی۔ نوید مجھے لائبریری کے قریب مل گئی کہنے لگی آپ نے مینا کو ناراض کر دیا۔ میں نے بھولپن سے پوچھا کیا ہوا۔ مجھ سے کونسی غلطی ہوگئی؟ وہ بیمار ہے آپ نے اس کی خبر بھی نہیں لی۔ میں نے سوچا چلو اسی بہانے صلح ہو جائے گی۔

سہ پہر کے وقت مجھے ایک کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ اس میں ایک بوسیدہ سی دری بچھی تھی۔ اس پر صدیوں پرانا میلا چیکٹ گاؤ تکیہ پڑا تھا۔ دو ٹوٹی ہوئی کرسیاں گرد سے اٹی پڑی تھیں۔ چھت پر سیلنگ فین لگا ہوا تھا۔ اس کے پَر چوبی تھے۔ یہ کمرہ اُن خزاں رسیدہ بہاروں کا پتہ دیتا تھا۔ جن کا جوبن بگولے لے اڑے تھے۔ پتہ نہیں یہ کب سے یونہی خستہ خراب پڑا اچھے دنوں کا ماتم کر رہا تھا۔ یہ درمیانی منزل تھی۔ اس کے پہلو میں اسی منزل پر دوسرے کونے پر مینا کا دفتر تھا۔ بیچ میں دو ایک کمرے تھے جو مینا کے مریضوں کے کام آتے تھے۔ نوید مجھے چھوڑ کر مینا کو اطلاع کرنے چلی گئی تھی۔ میں نے گرد و پیش کے متعلق سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی صرف ہلکا سا جائزہ لیا تھا کہ میں نے دیکھا مینا اکیلی آہستہ آہستہ آرہی تھی۔ آج اس کے ملبوسات میں سرسراہٹ نہیں تھی۔ وہ پژمردہ سی تھی۔ میں نے کہا خیریت تو ہے؟ کہنے لگی "مجھے اپنڈے سائیٹس ہے۔ کبھی کبھی دورہ پڑ جاتا ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ کو میری وجہ سے بڑی تکلیف ہوئی۔" یہ سن کر مسکرانے لگی۔ میں نے مزید تشریح کی۔ اوپر کی منزل

سے یہاں تک آنے میں کتنی ہی سیڑھیاں اترنا پڑی ہونگی ۔ مسکرا کر کہنے لگی ۔

" آپ کے کتنے دل ہیں ؟ " میں اس کے اس اچانک انوکھے سوال پر چونکا

" میرا خیال ہے انسان کے پاس ایک ہی دل ہوتا ہے ۔ " میں نے بھولپن سے جواب دیا ۔

" لیکن آپ کے تو شاید سو دل ہیں اور شاید آپ بانٹتے بھی دیتے ہوں گے ۔ "

اس نے درد سے پہلو بدلا ۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہا آپ آرام کیجئے ۔ میری وجہ سے آپ کی تکلیف میں اضافہ ہوگا ۔ کہنے لگی بیٹھئے چائے پی کر جائیے گا ۔ اتنے میں ایک گندہ سا لڑکا کسی گھٹیا سے ہوٹل کے میلے کچیلے برتنوں میں چائے لے آیا ۔ چائے کی ٹرے خود پکڑ کر نوید نے اسے رخصت کر دیا ۔ مینا کہنے لگی چائے ٹھنڈی ہو جائے گی ۔ میرے ہاتھ موقعہ لگا میں نے کہا " آپ نے میری دعوت قبول نہیں کی تھی ۔ اس لیے میں آپ کی چائے نہیں پیونگا ۔ " کہنے لگی " نہیں پیئں گے تو میں گلی میں پھینک دونگی ۔ " میں نے کہا " شوق سے پھینک دیجئے " ۔ وہ کہنے لگی " دیکھنے والے کیا کہیں گے ۔ " لیکن میں چپ رہا ۔ کتنی ہی دیر ہم سب خاموش بیٹھے رہے ۔ اس نے ایک مرتبہ پھر پوچھا نہیں پیئں گے ؟

" نہیں "

" پھینک دوں ؟ "

" پھینک دیجئے "

اور اس نے کیک اٹھا کر گلی میں پھینک دیا ۔ میں ناراض ہو کر چلا آیا ۔

صلح کی بجائے ناراضگی میں اور بھی اضافہ ہو گیا ۔

O

ہم دونوں اپنی اپنی ضد پر قائم رہے۔ طرفین میں سے کوئی بھی اپنے اندر لچک نہ پیدا کر رہا تھا۔ میں خاموشی سے کلاس میں آتا اور چپکے سے اٹھ کر چلا جاتا۔ میں کچھ بیزار سا بھی رہنے لگا تھا۔ اسی لیے گفتگو بھی کم ہی کرتا تھا۔ اجو حیران تھی "پہلے تو کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ جانے کیا بات ہے؟" کتنے ہی دن یونہی گزر گئے۔ ایک دن مایوسیوں نے چاروں طرف مجھ پر یلغار کر دی۔ میں اداسیوں میں گھرا ہوا تھا۔ مجھے عتیق کی یاد ستانے لگی۔ میں اس سے تقریباً مایوس ہو چکا تھا۔ مجھے اس کی بے وفائی کا یقین سا آ رہا تھا۔ مجھے یہ بھی قلق تھا کہ عتیق نے نکاح کے وقت کیوں ہاں کر دی۔ اس وقت وہ میرے دل پر شاق گزر رہی تھی۔ میں نے زندگی کی سب مسرتیں اس پر قربان کر دی تھیں اور اس نے مجھے کبھی نہ مرجھانے والے آنسوؤں کے ہار دے دیئے تھے۔ میں نے ان کو بھی سینے سے لگا لیا۔ مگر یہ سینے کو ٹھنڈک نہیں پہنچاتے تھے۔ ان میں تو آگ ایسی تپش تھی، کانٹوں ایسی چبھن تھی۔ مجھے اپنے غموں کا مداوا اپنا کا "مخفی پیار" یاد آنے لگا۔ مگر وہ تو مجھ سے روٹھی ہوئی تھی۔ کوکب میرے ذہن پر ابھری۔ میں نے اپنے درد کو کم کرنے کے لیے کوکب کے نام ایک رقعہ لکھ کر نوکر کو دے دیا۔ رقعہ بڑا مختصر سا تھا۔

عزیزی کوکب!

"میں بہت اداس ہوں تم جلدی چلی آؤ۔"

"دیپک"

کوکب آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک رقعہ بھی تھا۔

"کوکب کے ہاتھ اپنا تجریدی آرٹ بھی بھیج دیں۔"

ان الفاظ کے نیچے کسی کے بھی دستخط نہیں تھے۔ غالباً یہ بینا کی تحریر تھی۔ میں نے رقعہ کوٹ کی جیب میں ڈال لیا اور کوکب سے کھیلنے لگا۔ مجھے اچھے بچوں سے بڑی محبت ہے۔ میں نے اس کے لیے مٹھائی منگوائی۔ اس نے تھوڑی سی کھائی اور پھر ہاتھ کھینچ لیا۔ میں اسے بازار لے گیا۔ اس کے لیے جاپانی کھلونے خریدے۔ میں نے کہا کوکب تم میرے پاس رہا کرو۔ میں تمہیں بڑے خوبصورت کپڑے بنوا کر دوں گا۔ بہت سے کھلونے لاؤں گا۔ اور اسی طرح اس کا دل بہلاتا رہا۔ وہ کچھ دیر تو میرے ساتھ آہستہ آہستہ چھوٹی چھوٹی پیاری پیاری باتیں کرتی رہی۔ پھر وہ بسورنے لگی۔ میں نے بہت جتن کیئے مگر اس کے منہ میں ایک ہی لفظ تھا۔ "امی"۔ وہ رونے لگی۔ اسے یہ تنگ سا ماحول راس نہ آیا۔ اسے بہت سی ٹافیاں دے کر میں نے نوکر کو کہا، اسے تانگے پر بٹھا کر چھوڑ آؤ۔ اس کے جانے کے بعد میں پھر اداس ہو گیا۔

○

چند روز گزرنے کے بعد نوید نے مجھ سے ایک کتاب مانگی۔ میں نے دے دی۔ دوسرے دن وہی کتاب انجو نے مانگی۔ میں اسے بھی جواب نہ دے سکتا تھا۔ انجو نے اصرار کیا تو میں نے کہا "اچھا"۔ میں امتحان میں پڑ گیا کہ اب کیا کروں۔ میں نے سوچا یہ لونڈیاں شاید میرا امتحان لے رہی ہیں۔ پھر کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ دو ایک دن انجو سے ملاقات ہی نہ ہو سکی۔ نوید نے کتاب مجھے دینے کی بجائے لائبریری کلرک کو دے دی تھی۔ کتاب کے کور پر کوئی دس ہزار مرتبہ میرا نام لکھا ہوا تھا۔ کوئی بھی جگہ خالی نہیں تھی کہیں

کہیں کتاب کے اندر بھی نام تھا۔ یہ دیکھنے کے لیے میں ورق گردانی کر رہا تھا کہ ایک جگہ سے مجھے ایک فوٹو جو کسی نوجوان کا تھا اور ایک لمبا ناخن کٹا ہوا ملا۔ میں نے وہ دونوں چیزیں نکال لیں۔ چند صفحات اور الٹے تو کچھ ابریشم ایسے بال ملے۔ میں نے وہ بھی نکال لیے کتاب انجو کو دینا چاہی۔ اس نے کہا میں نے لائبریری سے لے لی تھی میں اس کی ناراضگی کو سمجھ رہا تھا۔

نوید نے پھر وہی کتاب مانگی۔ فوٹو کی پشت پر میں نے بیٹھے بٹھائے اپنے دو پسندیدہ شعر لکھ دیئے تھے۔ لیکن اس وقت مجھے قطعی کوئی خیال نہ آیا۔ میں نے فوٹو، ناخن اور بال اسی طرح رکھ کر کتاب دے دی۔ چند دنوں کے بعد مجھے پھر کتاب واپس ملی تو وہ سب چیزیں اپنی پہلی جگہ پر موجود تھیں۔ اب کی میں نے بھی انہیں نہیں چھیڑا۔ پھر دوسرے دن مینا آئی۔ میں کلاس میں نہیں تھا۔ لڑکے مجھے گھسیٹ کر لے گئے۔ کہنے لگے ایک نئی لڑکی آئی ہے شاید نوید کی بہن ہے۔ سب لڑکیاں تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔ لیکن میں خود ہی نہیں ہنس رہا تھا۔ ان کو بھلا کیا ہنساتا۔ لڑکیاں اس انتظار میں تھیں کہ میں ابھی قرون اولیٰ کا سا لہجہ اور صحرا نوردوں کا سا انداز اختیار کرونگا اور ہنسی کے مارے سب کے پیٹ میں درد شروع ہو جائیگا۔ مگر میرے تو اپنے سر میں درد تھا۔ مینا کچھ دیر بس پر وہ بیٹھی رہی پھر اٹھ کر چلی گئی۔

مجھے شک گزرا شاید مینا میرے لیے آئی ہو مگر اس نے تو مجھے بلایا تک نہیں تھا جبکہ میں تو اس کی شکل بھی نہیں دیکھ پایا تھا۔ البتہ ایک جھلک ضرور نظر آئی تھی۔ پھر نوید نے بھی کوئی بات یا کوئی اشارہ نہیں کیا تھا۔ میں نے بھی اس بات کو ذہنی مفروضہ سمجھ کر بھلا دیا۔ یہ ایک نئی الجھن پیدا ہو رہی تھی۔ میں نے اس سے

نجات حاصل کرنا ہی بہتر سمجھا - لیکن میرا یہ خیال دیر پا نہیں تھا - میں پہلے سے بھی زیادہ سوچ میں ڈوب گیا تھا - چند دن بعد مجھے ایک خط ملا - جس کی عبارت یوں تھی -

" مجھے زہر دے دیجئے - "

" بینا "

یہ خط مجھے کلاس میں ملا جو پوسٹ ہو کر آیا تھا - میں نے اس کا مطلب سمجھنا چاہا لیکن میں کچھ بھی نہ سمجھ سکا - دماغ ماؤف ہو گیا - آخر میں نے اس مسئلہ کو کچھ دیر کیلئے اپنے سے علیحدہ کر دیا - لیکن دوبارہ سوچنے پر بھی میرے پلے کچھ نہ پڑا -

میں خود بے چین تھا ، میں بینا کے دفتر میں چلا گیا - وہ بڑی سنجیدگی سے پوچھنے لگی :- " آپ کیسے آئے ہیں ؟ " میں حیرانی سے اس کا منہ تکنے لگا - دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ تھا کہ آپ کیوں آئے ہیں ـــ میرا رنگ زردی مائل ہو گیا - پھر وہ مسکرانے لگی - کہنے لگی -

" آپ زہر لائے ہیں ؟ "

" ہاں "

" کہاں ہے ؟ "

میں نے زہر کی شیشی اس کے ہاتھ میں دے دی - دیکھ کر کہنے لگی اتنی چھوٹی سی - گولیاں بھی تھوڑی سی ہیں اور بالکل چھوٹی ہیں - پھر وہ اس کا نام پڑھنے لگی جو بہت باریک لکھا ہوا تھا - کہنے لگی اس سے آدمی مر جاتا ہے - میں نے کہا تم ڈاکٹر ہو - تمہارا نالج مجھ سے یقیناً وسیع ہو گا - کیا یہ دو آدمیوں کے لیے کافی نہیں ہے ؟ وہ بن رہی تھی - زہر کی کیفیت اور نام پوچھ رہی تھی - مجھ سے نام پوچھا تو میں

شیشی اس سے لے کر پڑھنے لگا، جیسے مجھے بھی اس کا نام یاد نہ ہو، اور نام پڑھتے پڑھتے شیشی اپنی پینٹ کی جیب میں ڈال لی۔ کہنے لگی۔ کس ہوشیاری سے آپ نے شیشی لے لی۔ میں مسکرانے لگا۔ کہنے لگی۔

"محبت کرنے والے فریب نہیں کیا کرتے۔"

"محبت تو خود ایک فریب ہے مینا"

"کیا آپ سچ کہتے ہیں؟" اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"ہاں" میں نے متانت کا اظہار کیا۔

"کیا آپ واقعی سچ کہتے ہیں۔" اس کی پیشانی پر بل پڑ چکے تھے۔

"ہاں" میں نے پورے وقار سے کہا۔

"کیا آپ سچ مچ کہتے ہیں؟" اس نے تقریباً چیخ کر کہا۔

"ہاں" میں نے بڑے اطمینان سے بے نیازی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"تو جائیے" اس نے بڑی بیزاری سے کہا۔ اس کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔

"کہاں؟" میں مسکرانے لگا۔

"آپ بہروپیئے ہیں۔" اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔ کہنے لگی

"آپ ہما کو سچے دل سے چاہتے ہیں؟"

"ہاں"

"وہ بہت خوب صورت ہے؟"

"وہ تو میری مارگریٹ ہے۔" میں مسکرانے لگا۔

"آپ اس سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟"

"ہاں"

"بالکل سچ ؟"

"ہاں"

"بالکل سچ ؟"

"ہاں"

"بالکل سچ"

"ہاں" میں مسکرانے لگا۔

"آپ مسکراتے کیوں ہیں ؟"

"پتہ نہیں ۔"

اور وہ ناراض ہو کر دوسرے کمرے میں چلی گئی ۔ میں واپس آگیا ۔

---

(۴)

میرا خیال تھا وہ مجھے ملنے آئے گی!

میں اپنی جگہ روٹھا ہوا تھا، وہ اپنی جگہ ناراض بیٹھی تھی۔ مگر جانے میرا جی کیوں چاہنے لگا تھا کہ وہ مجھے منانے آئے۔ میں اس کے متعلق بہت سی باتیں سوچنے لگا تھا۔ کچھ اس طرح کا احساس تھا جیسے میں اس سے بے حد مانوس ہو رہا ہوں اور کبھی تو لگتا جیسے مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے۔ اگرچہ میں نے اپنے آپ کو پیار کی حرارت سے الگ رکھنے کی کوشش کی تھی۔ جذبات کی رو ایسا نہ چاہنے کے باوجود مجھے اپنی روانی کے ساتھ بہا لے گئی تھی۔ جھوٹا ہی وقار سہی لیکن میں اسے قائم ضرور رکھنا چاہتا تھا۔ جب کسی سے پیار ہوتا ہے تو ہمی گھڑت کلیسے کانچ کی طرح ٹوٹ جاتے ہیں۔ میں نے سوچا پہل مجھے ہی کرنا پڑے گی۔ میں کچھ دل کے ہاتھوں مجبور سا ہو رہا تھا۔ اس کا کوئی پیغام کوئی رقعہ نہ آ رہا تھا۔ حالانکہ یہ سب کچھ متوقع تھا۔ میں اپنے وقار اپنے کلیسے کو داغدار ہونے سے بچاتا رہا مگر اس کے باوجود خط لکھنے

کی خواہش شدت اختیار کرتی گئی۔ لکھتے وقت مختصر سی تحریر میں میں نے جذبات کی عکاسی کے باوجود کچھ طنز اور کچھ مزاح سے کام لینا چاہا مگر لکھنے کے بعد پتہ چلا نہ تو اس میں طنز تھی نہ مزاح۔ حالانکہ میں اپنی اس مجبوری کے باوجود اپنی خودی پر ضرب نہیں لگانا چاہتا تھا۔ اس کے باوجود لکھنے سے پہلے مجھ پر سنجیدگی طاری ہو گئی۔ میں نے لکھا :۔

"مجھے ایسا احساس ہوتا ہے جیسے میں واقعی تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ ڈرتا ہوں کہیں یہ جذبہ شدت نہ اختیار کر جائے۔
عنوان نہیں لکھ سکا۔ ممکن ہے ڈیر لکھنے سے تم بُرا مان جاتیں۔ ڈیر نہ لکھتا تو کیا لکھتا۔
کیا تم اس گتھی کو سلجھا سکو گی ؟
میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا "تمہارا لکھوں یا "ایک غیر" لکھوں۔
کیوں میرا امتحان لے رہی ہو ؟"

"دیپک"

میں نے خط مکمل کیا تو میرا موڈ بدل گیا۔ میں اسے پوسٹ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن میں اسے پھاڑ بھی نہ سکا۔ ہاتھوں میں لیے دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ ذہنی انتشار کیوجہ سے کسی فیصلہ پر نہ پہنچ رہا تھا۔ میں نے تو سوچا تھا اب کبھی محبت جیسی کسی چیز کو قریب بھی نہ پھٹکنے دوں گا۔ میں تو پھر اسی عذاب میں پھنسنے والا تھا۔ تجربے روز روز نہیں ہوتے۔ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں اس محبت کا انجام بھی پہلا سا نہ ہو۔ زخم دیکھ کر ناخن اپنا قرض ادا کرنے کی نہ سوچیں۔ تاہم میں نے وہ خط جیب

میں دکھ لیا۔ تذبذب کی وجہ سے کوئی فیصلہ نہ ہو پایا۔

چلتے چلتے جانے میں کیوں رک گیا۔ منتشر خیالات سمیٹنا چاہے تو مجھے احساس ہوا جیسے نوید سامنے کھڑی ہے۔ میں نے سنبھلتے ہوئے اسے دیکھا۔ واقعی وہ کھڑی تھی۔ میں اپنی اس عجیب سی حالت پر مسکرا دیا۔ نوید بھی مسکرا دی۔

"آپ کھوئے کھوئے سے کیوں ہیں۔"؟

"میں تمہیں ڈھونڈ رہا تھا۔"

"عجیب اتفاق ہے۔"

"کیوں"

"میں بھی تو آپ کو ڈھونڈ رہی تھی۔"

"واقعی"

"تمہیں یقین نہیں؟"

"آپ کہتے ہیں تو میں مان لیتی ہوں۔ میں تو سمجھتی ہوں اس دنیا میں ہر کوئی اسے ڈھونڈ رہا ہے۔ جو کسی اور کو ڈھونڈ رہا ہو اور جس کے ملنے کے امکانات بہت کم ہوں کتنی عجیب بات ہے کہ آپ مجھے ڈھونڈ رہے ہیں۔" وہ ہنسنے لگی۔

"بھئی تم تو فلاسفر سی لڑکی ہو۔" میں کھسیانا سا ہونے کے باوجود مسکرانے پر تلا ہوا تھا۔ اس نے اور بھی سنجیدہ بن کر کہا۔

شاید کوئی آپ کو بھی ڈھونڈ رہا ہو۔"

"شاید۔ ویسے ہے تو خوش قسمتی۔ تمہارا کیا خیال ہے۔"

"آپ کو مذاق سوجھ رہا ہے اور وہ سخت بیمار ہے۔ یہ رہا رقعہ۔ اب آپ

جانیئے۔" نوید مغموم سی مجھے وہیں چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔

میرا جی چاہا میں رقعہ کو کھول لوں اور وہیں کھڑے کھڑے ایک ہی لمحہ میں ساری تحریر پڑھ جاؤں۔ لیکن دل ڈرتا تھا۔ جانے اس نے کیا لکھا ہو۔ کہیں کوئی بہت سخت قسم کی بات نہ ہو۔ میں نے اسے جیب میں ڈال لیا یہ سوچتے ہوئے کہ شاید کوئی محبت کا قصہ ہو۔ راہ چلتے لوگ چہرے کے تاثرات سے قیاس آرائیاں کیوں کریں۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے لوگ اس میں دخل کیوں دیں۔ میں بے چین سا تھا کہ وہ لمحہ جلد آئے جب میں اسے کھول کر پڑھ سکوں۔ شاید اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا ہو۔ اس نے اپنے خط میں مجھ سے معافی مانگی ہو۔ میں بڑی فراخ دلی سے اسے معاف کر دوں گا۔ وہ ایک اچھی لڑکی ہے۔ ہمارے درمیان چپقلش کی کوئی خاص بات بھی نہیں ہے۔ سرسری سی بات تھی۔ اس کا یوں دامن جھاڑ کر نخوت سے اٹھ جانا مجھے ذرا بُرا لگا تھا۔ معمولی سی بات تھی جسے اس نے اتنی شدت سے محسوس کیا۔ یہ میری بھی غلطی تھی کہ میں بُرا مان گیا۔ اور وہاں بیٹھ نہ سکا۔ مجھے یوں اٹھ کر نہیں آنا چاہیئے تھا۔ آ ہی گیا تھا تو پھر منانے چلا جاتا۔ میں اپنے کیے پر دل ہی دل میں پچھتا رہا تھا۔

سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگانے کے بعد میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ میرا جی چاہا میں پھر اٹھ کر قالین پر ٹہلنے لگوں۔ لیکن میں بیٹھا رہا۔ میں سوچنے لگا۔ کیا سچ مجھے اس سے محبت ہوتی جا رہی ہے۔ کہیں یہ محبت اتنی شدت نہ اختیار کر جائے کہ میں اپنے سود و زیاں کا امتیاز ہی نہ کر سکوں۔ جانے کیوں خفیف سا خطرہ دھند کی طرح میرے قلب و ذہن پر چھا رہا تھا۔ میں نے دوسرا سگریٹ سلگاتے ہی رقعہ کھولا۔

لکھا تھا :-

پیارے دیپک

سب سے پہلے کیوں نا میں اس بات کی معافی مانگ لوں کہ آپ کا اتنا قیمتی وقت میری حماقت کیوجہ سے ضائع ہُوا - بے وجہ جو آپ کو لکھ دیا ۔ ۔ ۔ جانے میرا جی یہ کیوں چاہنے لگا ہے کہ جب میں مرنے لگوں تو آپ میرے سرہانے کھڑے ہوں۔ شاید آپ کو اس سے ذہنی اذیت پہنچے - لیکن میں سکون سے اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں گی -

کیا آپ ایسا کر سکیں گے ؟

اگر میری محبت کی کوئی قیمت ہوتی تو میں محبت کا واسطہ دے کر آپ کو بُلا لیتی - اب میں آپ کو کیسے مناؤں ؟

آپ سوچتے ہوں گے بیتا کتنی پاگل ہے ۔ ۔ ۔ شاید یہ ٹھیک بھی ہے لیکن ایک راز کی بات آپ کو بتاؤں -

محبت کرنے والی ہر لڑکی پاگل ہوتی ہے - اس کی ڈگریاں اس تند و تیز آندھی میں خاک بن کر اڑ جاتی ہیں - اس کے پاس صرف دلِ ناتواں رہ جاتا ہے جو پہلے ہی گھائل ہو چکا ہوتا ہے -"

ایسی صورت میں میں بھلا کیا سوچ سکتی ہوں - میں کچھ سوچنا بھی نہیں چاہتی - مجھے تو اس بات میں زیادہ مزا آتا ہے ۔ ۔ ۔ میں محبت میں دیوانگی پسند کرتی ہوں - آپ سوچ رہے ہوں گے - دیوانی تو ہے ہی - لیکن میں سچ

کہتی ہوں کہ یہ میری دلی خواہش ہے کہ میں ہوش و حواس کھو دوں۔
آخر میں میں دل کی عمیق گہرائیوں سے دعا کرتی ہوں کہ آپ بے حد خوش رہیں۔ پتہ نہیں میں ایسا کیوں چاہتی ہوں۔ دل پر کس کا زور ہے۔ تاریخ کے شواہد بھی یہی بتاتے ہیں۔ پھر بھلا میں کمزور سی لڑکی کیا حیثیت رکھتی ہوں۔
کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے آپ زار و قطار رونے لگیں۔ میں اپنے آنچل سے آپ کے آنسو پونچھتی رہوں۔ آپ کے آنسو بہتے ہی رہیں۔
جانے کیسی کیسی خواہشیں میرے دل میں پنپ رہی ہیں۔ میں کیا کروں؟ انسان ہوں، پتھر نہیں۔ دل پر کسی کا زور ہے!!
آپ بیشک مجھے اپنا نہ سمجھیں میں آپ کی پوجا کرتی رہونگی۔
سخت بخار نے میرے ہوش حواس ٹھکانے نہیں رہنے دیئے اگر کچھ اوٹ پٹانگ لکھ دیا ہو تو ازراہ کرم نظر انداز کر دیں۔۔۔۔ کہتے ہیں درگزر اور چشم پوشی مدبر آدمیوں کا کام ہے۔ اور مرد ہمیشہ سے مدبر ہے۔ شاید ابد تک رہے۔
میں پھر بہکنے لگی ہوں۔ میری آخری خواہش کا احترام کیجئے گا۔ چاہے ایک لمحہ کے لیے ہی آئیں۔ کیا آپ جانکنی کی اس حالت میں بھی میرے لیے ایک لمحہ صرف نہ کر سکیں گے؟ وہ وقت آیا ہی چاہتا ہے۔ دیپک کا کام جلنا تھا آپ نے الٹا مجھے ہی جلا دیا ———— ایک آرزومند

"مینا"

خط پڑھنے کے دوران میری آنکھوں میں جو آنسو چھلکے گالوں پر پھسل پڑے ---
--- میرا دل پگھل چکا تھا۔

دل سوز تحریر نے دل کے تار چھیڑ دیئے تھے۔ میں تو اپنے جھوٹے وقار کی خاطر اسے ملنے نہ جا سکا تھا۔ میرا نازک دل تو پہلے ہی تار تار ہو چکا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو خود فریبی کے سنہری جال میں پھنسائے رکھا۔ یہ میرا ایک جھوٹا خواب تھا۔ اس کا طلسم کہاں تک رہ سکتا تھا۔ میں شکست کھا چکا تھا اور اس شکست کو چھپانے کی خاطر نظریات کے جھوٹے بُت بنا کر انہیں پُوجتا رہا۔ اب حقیقت میرے سامنے چٹان کی طرح کھڑی تھی۔

میں مختلف خیالات میں گھرا ہوا گھبرا رہا۔ وسوسے بھی تھے حقیقت بھی۔ ایک لمحہ کے لیے جانے میں نے کیوں سوچا۔ ہو سکتا ہے اس نے محض بہانہ بنایا ہو...
... "کیا وہ سچ مچ بیمار ہے؟" تحریر تو اس کے دل کا آئینہ لگتی ہے۔ پھر میں کیوں شک کروں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی ذہنی کیفیت وہی ہو جو میری ہے۔ وہ ابھی کچھ طے ہی نہ کر پائی ہو کہ مجھے اپنا لے یا چھوڑ دے۔ میں سوچتا رہا اس کے پاس جاؤں یا رُک جاؤں۔ میں نے اپنے آپ سے ایک چھپا ہوا راز دریافت کیا۔

"کیا واقعی میں اسے چاہنے لگا ہوں؟"

یہ راز میں نے پہلے بھی جاننا چاہا تھا لیکن شاید کسی جذبے کے تحت اسے ٹالتا رہا تھا۔ کسی وجہ سے یا کسی مخفی خوف سے میں دو حرفی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے استدلال سے کام لیا۔ میں نے اپنے سامنے تاویلیں پیش کیں۔ میں باریک سے باریک نکتوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ اور اس طرح میں اور بھی اُلجھ

گیا۔ میرے لیے کسی فیصلہ پر پہنچنا مشکل ہو گیا۔ میں نے یہ قصّہ کسی اور وقت پر اٹھا رکھا۔

چند دن یونہی گزر گئے۔

میں شاید اس کی نظروں میں اپنی وقعت اور بڑھانا چاہتا تھا۔ میرے تحت الشعور میں شاید کوئی ایسی خواہش چھپی ہو یا شاید مجھے سچ مچ اپنی اہمیت کا احساس تھا۔ احساسِ برتری تھا یا احساس کمتری۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کیا تھا۔ لیکن یہ ضرور تھا کہ اس کی یاد دل میں چٹکیاں لیتی رہتی تھی۔ آہستہ سے سازِ دل کو چھیڑتی اور بادِ صبا کی طرح گزر جاتی تھی۔ میں یادوں کے حسین رنگوں کی دلکشی میں کھو جاتا تھا۔ جانے کیوں مجھے اس کے کسی اور خط کا انتظار رہتا۔ اپنا تجزیہ میں نے کبھی نہ کیا۔ اپنے خاص معاملات میں انسان تجزیے کے جھنجٹ میں پڑتا ہی کب ہے۔ اسی ادھیڑ بن میں میں اس کے پاس جا ہی نہ سکا۔

جس خط کا مجھے انتظار رہتا تھا وہ خط نہ آیا۔ شاید وہ مجھ سے واقعی ناراض ہو گئی تھی۔ میرا جی چاہتا کہ میں اسے منا لوں۔ مگر پھر میں وہاں کیوں نہیں جاتا تھا۔ وہ کون سی غیر مرئی طاقت تھی جو مجھے روکے رہتی تھی۔ شاید میرے دل میں یہ خدشہ کروٹیں لینے لگتا تھا کہ اس طرح سے میں اپنی قدر کھو دوں گا۔ ہو سکتا ہے اس کے بعد اسے مجھ سے محبت نہ رہے یا وہ مجھ سے نفرت کرنے لگے۔ اگر ایسا ہو گیا تو میری پوری شخصیت مسخ ہو کر رہ جائے گی۔ شاید یہ زخم اتنا گہرا نہ ہو جتنا میں سمجھ رہا تھا۔ ہو سکتا تھا ناکامی کی صورت میں عقیق ایک مرتبہ پھر میرے حواس پر سوار ہو جاتی۔ پھر میری حالت اور بھی مخدوش ہو جاتی۔ جانے میں یہ

کیوں چاہنے لگا تھا کہ عتیق مجھے بالکل یاد نہ آئے۔ وہ میرا ماضی تھی۔ میری محبت تھی۔ میری محبت کا عتیق تھی۔ جسے میں ہر لمحہ سینے سے لگائے پھرا کرتا تھا۔ مگر اب مجھے اس کی یاد سے اس قدر اجتناب کی ضرورت اتنی شدت سے کیوں محسوس ہونے لگی تھی میں اس کے متعلق ذرا بھی سوچنے کے لیے تیار نہ تھا۔ شاید مجھے سوکھے زخموں کا ایک مرتبہ پھر سے ہرا ہو جانا پسند نہ تھا۔ بظاہر یہ بات کچھ غلط سی لگتی تھی کیونکہ میں طبعاً اذیت پسند واقعہ ہوا تھا۔ ع

زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

بہرحال میں اس جھمیلے میں پڑنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ میں نے عتیق کو بھول جانے کی شعوری کوشش کی۔ کسی حد تک کامیاب بھی رہا۔ لیکن شاید پوری کامیابی کیلئے مجھے مینا کی تصویر کو سینے کے ساتھ چمٹانا تھا۔ میں پوری توجہ سے مینا کے متعلق سوچنے لگا۔ بلاشبہ وہ میرے زخموں کا ٹھنڈا مرہم تھی۔ مینا میرے دکھ کا مداوا۔ اس کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے ابھرنے لگی۔ اس تصویر کی کشش سے میں اس کی جانب کھنچتا چلا گیا۔

مینا درمیانے قد کی کھلے کھلے سانولے حسن کی چوبیس پچیس سالہ دوشیزہ تھی۔ لباس کے معاملے میں اس کا ذوق اتنا نفیس تھا کہ میں والہانہ اس کی اس ادا پر فدا ہو جاتا۔ پیار بھری ناراضگی سے جب وہ میری طرف ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالنے کے بعد نظریں جھکا لیتی تھی تو دل میرے بس میں نہ رہتا تھا۔ میں اس کی ان ہی اداؤں پر فریفتہ تھا۔ اس کی دوسری چیز جس نے میرے دل پر گہرا تاثر چھوڑا تھا اس کے بال بنانے کا انداز تھا۔ یہ بال سر کی پشت پر کنڈلی مار کر بیٹھ جاتے۔ بالوں کا یہی

دھنڈرہ عام حسن سے الگ کر کے اسے انفرادیت بخشتا تھا۔ باریک ریشمی دوپٹے کا مہین کلاؤ اس پر جا کر اکثر اٹک جاتا تھا۔ جب وہ روٹھنے کے انداز سے نظریں جھکاتی تو دوپٹے کا کنارا کندھوں پر گر جاتا۔ زلفوں کی کنڈلی بالکل ننگی ہو جاتی۔ میری نظریں مستانہ وار عین اس جگہ پر مرکوز ہو جاتیں۔ میرے مسلسل دیکھنے پر وہ بدن کو چرا لیتی۔ ایک نظر میری طرف دیکھتی اور کہتی۔

"آپ مجھے ان نظروں سے نہ دیکھا کریں۔"

"کیوں"

وہ شرما جاتی۔ میں نظریں اس پر گاڑھ دیتا۔ مگر پھر نظروں میں پیار کی وہ مدہم تپش نظر نہ آتی۔ اسے وہ تپش بڑی عزیز تھی۔ کبھی کبھی میری آنکھوں میں شاید شعلے بھڑک اٹھتے تھے اور یہ شعلے اسے پسند نہ تھے۔ جب یہ شعلے بجھ جاتے تو وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتی۔ میری نظروں میں پیار کی ہلکی سی تپش عود کر آتی اور وہ گاگل اٹھا کر میری آنکھوں پر رکھ دیتی۔ میں مسکرانے لگتا۔ اس چھوٹے سے کمرے میں بلب ہمارے سروں پر ہمارے دلوں کی طرح روشن رہتا۔ میں گاگل کے سیاہ انگلش گلاس سے بلب کو اور پھر اس کو دیکھتا اور دیکھتا ہی رہ جاتا۔ وہ میرے گاگل اتار دیتی۔

"آپ کی آنکھیں کتنی حسین ہیں۔"

"سچ ؟"

"ہاں"

"مجھے بناتی ہو۔"

"کیا آپ مجھے ایسا سمجھتے ہیں۔"

" تمہارا دل کتنا حسین ہے۔"

" کاش آپ کا بھی اتنا ہو جاتا۔"

" کیا تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں۔"

" ہے تو پر ڈرتی ہوں —"

اس نے چپ سادھ لی

" چپ کیوں ہو گئیں ؟"

" مجھے ڈر لگتا ہے۔"

" کس بات کا ؟"

" یہ میں نہ بتا سکوں گی۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں میرے منہ سے نکلی ہوئی بات پوری نہ ہو جائے۔

" یہ تمہارا وہم ہے"

" خدا کرے وہم ہی ہو۔"

" وہم تو ہے ہی !"

" کیا واقعی آپ مجھے کبھی نہیں چھوڑیں گے۔"

" یہ آنے والا وقت تمہیں خود بتائے گا بیناؔ۔"

اس کے گالوں پر سرخی پھیل جاتی۔ وہ مجھے چاہت کی نظروں سے دیکھتی۔ میرا جی چاہتا میں اسے اپنے ساتھ چمٹا لوں مگر میں دانستہ ایسا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں اس سے صرف پیار کرنا چاہتا تھا۔ ایسا پیار جس میں صرف احساسات کا لمس ہو۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ کہیں اسے چھونے سے پیار کا یہ آئینہ چکنا چور نہ ہو جائے۔

مختلف قسم کے احساسات میں تصادم میرا روز کا معمول بن چکا تھا۔ سوچ کا سلسلہ وسیع تر ہوتا رہتا تھا۔ ان سوچوں میں پھول بھی تھے اور کانٹے بھی۔ زندگی کی روشنی بھی اور موت کی خوشبو بھی۔ کبھی کبھی تو یہ معمہ بالکل ہی الجھ کر رہ جاتا۔ میں ہمہ وقت اسی ادھیڑ بن میں رہتا۔ ہم ہر لمحہ صلح کرتے اور بات بات پر ناراض ہوتے۔ جب میں اٹھ کر چلا آتا اسی لمحہ اس کے خط کا انتظار شروع کر دیتا۔ اب بھی جس خط کا مجھے انتظار تھا وہ ابھی تک موصول نہ ہوا تھا۔ شاید وہ اپنے پہلے خط کے جواب میں میرے خط کا انتظار کرتی رہی ہو۔ میں اس کے خطوط کے جواب میں جانے کیوں خاموشی اختیار کر لیتا تھا اور اگر وہ ایسا کرتی تو میرے دل میں شعلے سے بھڑکنے لگتے۔ میرا کتنی ہی بار جی چاہا کہ اسے ایک خط لکھ دوں۔ خوش قسمتی سے میرے ذہن میں اچھی سی اچھی تحریر کا خاکہ نمودار ہوا۔ لیکن میں نے اسے کوئی خط نہیں لکھا۔ شاید تصادم میری جبلت میں شامل ہو گیا تھا۔ شعوری طور پر میں نے اس تصادم سے بچنے کی بہت کوشش کی لیکن میری یہ کوشش بھی پوری کی پوری رائیگاں گئی۔ اس سے میری ذہنی الجھنوں میں ذرا بھی فرق نہ پڑا۔ آخر میں نے تہیہ کر لیا کہ میں وہاں بالکل نہیں جاؤں گا۔ اور یہ فیصلہ میں نے کافی سوچ بچار کے بعد کیا تھا۔

یہ کتنی عجیب بات تھی کہ میں اس اٹل فیصلہ پر چند لمحے بھی نہ ٹھہر سکا۔ میں نے یہ اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ میرا رخ ادھر کو ہے جدھر جانے سے میں اب تک اپنے آپ سے جنگ کرتا آرہا ہوں۔ میں ہار گیا۔ یہ وہ لمحہ تھا جب میں بغیر کچھ سوچے چلا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی رہائش گاہ بالکل قریب آگئی۔ جب میں اس کی سیڑھیوں کے دروازے کے سامنے پہنچ چکا تو میں نے ایک لمحہ توقف کیا۔

ایک لمحہ کے لیے میں پھر الجھن میں مبتلا ہو گیا۔ میں چاہتا تو وہاں سے بھی واپس آ سکتا تھا۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ میرے قدم تو خود بخود اس کی جانب اٹھ رہے تھے۔ میرے پاس اب بھی کافی وقت تھا کہ میں کچھ سوچ سکتا اور سیڑھیوں ہی سے لوٹ آتا۔ میں اس نیت کو جس کا نام میں نے خودداری رکھ چھوڑا تھا۔ اب بھی پاش پاش ہونے سے بچا سکتا تھا۔ لیکن دوسرے لمحہ ایسا پر طوفان آیا تھا جو مجھے اپنی تند و تیز لہروں کے ساتھ بہائے لیے جا رہا تھا۔ میرے سارے اصول میرے سارے کلیے اس کی تیز روانی میں بہہ گئے تھے۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس وقت مجھے اس بات کا ذرا بھی احساس یا افسوس نہیں تھا۔ الٹا ایک نامعلوم سی خوشی اس بات کی تھی کہ میں مینا کو ملنے آ گیا ہوں اور مینا کتنی پیاری چیز ہے۔ اسی لمحہ میں اس کے کمرے کے دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ کامرانی کی مسکراہٹ میرے لبوں پر تھی۔ میں نے مزید کچھ سوچے بغیر دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ اس کھٹکھٹاہٹ کے ساتھ ہی مینا نے اٹھ کر دروازے میں جھانکا۔ میرا پچھلا پاؤں ابھی آخری سیڑھی پر ٹکا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں پچھلا پاؤں اٹھاتا میں نے مینا کو غور سے دیکھا وہ کچھ بیگانہ سی لگ رہی تھی۔ اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا :۔

" آیئے "

یہ آیئے " ایک ایسا بھرپور وار تھا کہ میرے دل کے کئی ٹکڑے ہو گئے۔ میرے لیے وہ پھر معمہ بن گئی۔ میں کچھ نہ سمجھا۔ اس لفظ سے دونوں پہلو نکلتے تھے۔ ایک تو یہ کہ آپ کیوں آئے ہیں۔ آپ کا یہاں کیا کام۔ جائیے چلے جائیے ورنہ میں نکالنے پر مجبور ہوں گی۔ اور یہ پہلو مجھے کچھ اتنا ناگوار لگا کہ میرا جی چاہا یہیں سے مڑ جاؤں لیے

کوئی گلہ ہی تھا تو کم از کم مجھے بٹھایا تو جاتا۔ پھر شکوے شکایتیں ہوتی رہتیں۔ معاملہ یہاں تک پہنچنے پر مجھے اپنی غلطی بلکہ حماقت کا احساس ہوا۔ مجھے یہاں آنا ہی نہ چاہیئے تھا۔ میں واپس جانے کے متعلق سوچنے لگا۔ اس "آیئے" میں پیار بھرا غصہ قطعی نہیں تھا بلکہ اجنبیت تھی۔ دل کو جلا کر راکھ بنا دینے والی اجنبیت۔ میں بے حد پریشاں ہوگیا۔ فیصلہ کرنا چاہا مگر کوئی فیصلہ بھی نہ کر سکا۔ میں سوچتا ہی رہا۔ دوسرا پہلو یہ بھی تھا کہ ہو سکتا ہے اس نے شکوہ کے طور پر یہ انداز اختیار کیا ہو۔ محبت میں ایسا بھی تو ہوتا ہے۔ اس نے ایک نظر مجھے دیکھا۔ جیسے میری پریشانی کو بھانپ گئی ہو اور اس کے لب آہستہ سے ہلے۔

"اندر آجایئے" اب کی لہجہ میں کچھ نرمی تھی۔۔۔۔۔

مگر یہ الفاظ بھی ہر قسم کے احساس سے مبرا تھے۔ ان الفاظ میں نہ تو نفرت تھی نہ لگاؤ ہی تھا۔ کس قدر روکھے پھیکے تھے یہ الفاظ۔ مجھے تو دہشت سی ہونے لگی اس رد دیئے سے۔ یا شاید میری نظروں میں دہشت تھی۔ اس دہشت کی تندہی کے دوران میری نظریں اس کے ریشمی ملبوسات پر پھسل گئیں۔ اس انوکھی اجنبیت کے باوجود وہ نظروں کو بڑی ہی پیاری لگی۔ میرا دل پگھل گیا۔ احساس زخمی ہوگیا۔ اس کا حریری لباس میرے لیے باعث مسرت بھی تھا اور جلن کا سبب بھی۔ میری موجودگی یا غیر موجودگی اس کے لیے یکساں تھی۔ کیا اس کی نظر میں میری اتنی ہی اہمیت ہے۔ میں جل کر راکھ ہوگیا۔ اتنے دنوں مجھے نہ پاکر تو اسے گریباں چاک ہونا چاہیے تھا مگر اس کی زندگی کی بہاروں میں ذرا بھی فرق نہ آیا۔ تو کیا وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی؟ کیا یہ سب ڈراما کھیلا جا رہا ہے؟ اس کے سانولے چہرے پر پاؤڈر کی ہلکی سی تہہ

جمی تھی۔ ہونٹ سرخی سے بھرے بھرے سے تھے۔ ناخنوں پر تازہ کیوٹیکس کی مہک تھی۔ سینٹ کی دھیمی دھیمی خوشبو ساری فضا کو رومان انگیز بنائے ہوئے تھی اس نے ریشمی پیازی غرارہ اور پیازی تنگ قمیض پہنی ہوئی تھی۔ یہ سب کچھ آخر کس کے انتظار میں تھا۔ کیا اسے کسی اور سے عشق ہو چکا ہے۔ میں سوچ میں گم اس کی طرف دیکھنے لگا۔ پیازی رنگ کا شفون کا دوپٹہ اس کے بالوں کی کنڈلی پر اٹکا ہوا تھا۔ میری نظریں وہیں جم گئیں۔ اس نے کنکھیوں سے مجھے دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔ دوسرے ہی لمحہ اس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔

"آپ سے بھول ہو ہی گئی جو یہاں چلے آئے۔"

"کتنی پیاری بھول ہے یہ۔"

میں نے تکدر کے بادلوں کو پرے ہٹا کر فضا کو خوشگوار بنانے کی کوشش کی۔ اس نے اسی سنجیدگی سے کہا۔

"آپ سے مجھے یہی امید تھی۔ میں پہلے بھی آپ کے متعلق یہی سوچا کرتی تھی۔"

"کیا" میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا

"کہ آپ مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بھول جائیں گے۔" اس کی زبان فرفر چل رہی تھی۔

"مجھے بھی تم سے یہی اُمید ہے۔"

"کیا"

"کہ تم مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بھول جاؤ گی۔ بلکہ بھول بھی چکی ہو۔"

"مجھ پر اتنا بڑا الزام نہ لگایئے۔ میں تو پہلے ہی بہت دُکھی ہوں۔"

"تمہارے ذہن میں یہ بات کیوں آئی کہ میں تمہیں بھول جاؤں گا۔ دل میں کوئی چور ہوگا نا۔"

"میرے دل کا چور تو آپ ہی ہیں"

"پھر یہ تمہیں کس نے کہا تھا؟"

"کیا"

"یہی کہ میں تمہیں بھول گیا ہوں۔" میری پیشانی پر شکنیں تھیں۔

"آپ کے عمل نے" اس نے اسی سنجیدگی سے کہا۔

"ذرا اپنے عمل پر بھی غور فرما لیا ہوتا" میرے لہجے میں ذرا تلخی تھی۔

"میں نے کیا کیا ہے۔" وہ حیران ہو کر پوچھنے لگی۔

"میں نے کیا کیا ہے" میں نے بھی وہی سوال دہرایا۔

اور یہ تھی ابتدا ہمارے گلے شکوؤں کی۔ ہم دیر تک اسی مدّوجزر میں کھوئے رہے۔ شکوؤں کی فضا محبت کے ماحول میں ڈھلنا شروع ہوگئی۔ سیاہ بادل جو ہمارے دلوں پر امنڈ آئے تھے پیار کی تیز ہوا سے اڑتے ہوئے دور بھاگ گئے۔ میں نے اسے کبھی نہ چھونے کی قسم سی کھا رکھی تھی۔ میں بس اس کی پوجا کرنا چاہتا تھا۔ محبت کی دیوی کو چھو لیا جائے تو اس کا تقدس ختم ہو جاتا ہے۔۔۔۔ نہ جانے کیوں میرے دل میں کھُدبُد سی ہو رہی تھی کہ اس کے ہونٹ چوم لوں۔ وہ مجھے کتنی پیاری لگنے لگی تھی لیکن میں اتنی بڑی جسارت کر بھی نہ سکتا تھا اور کرنا بھی نہ چاہتا تھا۔ اس کے ناراض ہو جانے کا بھی تو اندیشہ تھا۔ اس ذرا سی حرکت کی وجہ سے پھر مہینہ بھر کے لیے ہمارا ملاپ ختم ہو جاتا۔ آج جانے مجھے کیا ہو رہا تھا۔ میرا جی

چاہا کہ اس کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لیکر دیر تک سہلاتا رہوں مگر مجھے پھر اپنا اصول یاد آگیا اور میں اپنا اصول .... توڑنا نہ چاہتا تھا۔ میرا کتنا ہی جی چاہا کہ میں اسے جی بھر کر پیار کرلوں۔ پر ایسا ہو ہی نہ سکتا تھا۔ میں نے اپنے دل پر آپ ہی پہرے بٹھا لیے تھے اور پیار بھری نظروں سے پوجا کرنا ہی میرا نظریہ محبت تھا۔ اور یہ سب کچھ پیار کی بقا کے لیے ضروری بھی تھا۔ میری آنکھوں میں پیار کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اس نے میری نظروں میں جھانکا تو اسے جھرجھری سی آگئی۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا مگر نظریں اسی پر جمی رہیں۔ میری نظروں کی گرمی کی تاب نہ لاکر وہ اپنے بدن کو سمیٹنے لگی۔ مجھے وہ اور بھی پیاری لگی۔ میں نے چند الفاظ ادا کرنا چاہے۔ لیکن میں تو جیسے جذبات کے طوفان میں گھر چکا تھا۔ لبوں سے ایک لفظ بھی ادا نہ کرسکا۔ اس نے میری یہ کیفیت دیکھی تو اس سے بھی نہ رہا گیا۔

"آپ میری طرف اس طرح نہ دیکھا کیجئے"۔ وہ مسکرادی۔ یہ بھی اس کی ایک ادا تھی۔

"یہ کوئی میرے بس کی بات ہے"۔ مجھ پر دیوانگی سی چھا چکی تھی۔

"یوں کب تک ہوتا رہے گا۔"

میری سمجھ میں اس کی بات بالکل نہیں آئی۔ میں نے پہلے اس کے الفاظ کے متعلق سوچا اور پھر اسے غور سے دیکھنے لگا۔ وہ بالکل سنجیدہ صورت اختیار کر چکی تھی۔ میری نظروں کے تسلسل سے اس نے نظریں فرش پر گاڑھ دیں۔

"ہمارا اس طرح ملنا ٹھیک نہیں۔"

مجھے ایک دھچکا سا لگا۔ جذبات کے طوفان کی پرشور فضا غائب ہوگئی۔

مجھے یوں لگا جیسے وہ ایک ہی لمحہ میں بدل چکی ہے۔ شاید کسی نئی دوستی کی بنا پر مجھے چھوڑنا چاہتی ہے۔ میں مکمل سکوت میں گم ہوگیا۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا تھا۔ میں نے حیران حیران نظروں سے اسے دیکھا۔ اس نے اسی طرح فرش پر نظریں جھکائے جھکائے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔

"آپ بھی جوان ہیں۔ میں بھی جوان ہوں۔ ہمارا اس طرح ملنا ٹھیک نہیں۔ زمانہ کیا کہے گا۔ ہم اس طرح کب تک مل سکتے ہیں۔ امّی کہتی تھیں وہ تم سے شادی کیوں نہیں کر لیتا۔ میں نے اُن سے سب کچھ کہہ دیا تھا۔ میں اُن سے کوئی بات نہیں چھپاتی۔ انہوں نے مجھے اپنی پسند کی شادی کرنے کی اجازت دے رکھی ہے۔ میری وہ ماں بھی ہیں اور سہیلی بھی۔ ہم دونوں میں کسی بات کا پردہ نہیں ہے۔"

اتنا کہنے کے بعد وہ خاموش ہوگئی۔ میں بھی۔۔۔۔۔ خاموش تھا۔ اس چھوٹے سے کمرے میں مکمل سناٹا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے مجھے ایسا لگا جیسے بلب کی روشنی پھیکی اور مدھم ہو رہی ہے۔ میں نے اپنی آنکھیں پوری کھول دیں۔ وہ سنہرے سنیڈل کی نوک پر اپنے پاؤں کا انگوٹھا رگڑ رہی تھی۔ اچانک اس نے سر اٹھایا اور پوری سنجیدگی سے پوچھا:۔

"آپ میرے ساتھ شادی کریں گے؟"

"میں تم سے پیار کرتا ہوں۔"

یہ الفاظ میرے منہ سے فوری طور پر ادا ہو گئے تھے۔ میں نے ان کے متعلق پوری طرح غور نہیں کیا تھا۔ مجھے خود معلوم نہیں تھا کہ میں واقعی اس سے پیار کرتا ہوں۔

اور شادی کے بارے میں تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ یہ میرے لیے بالکل انوکھی بات تھی۔ مینا تو کسی کے لگائے ہوئے میرے پرانے گھاؤ کی مرہم تھی۔ ان زخموں کی جو عتیق نے مجھے دیئے تھے۔ محبت کا صلہ، محبت کا تحفہ جو میرے سینے کے لعل و جواہر تھے۔ مینا کا روپ تو ایک پیار تھا ــــ کیا شادی کرتے سے میرا پیار فنا نہ ہو جائے گا؟ اور اگر ایسا ہو گیا تو؟" کس قدر ہیبتناک ہوگا وہ منظر۔ عتیق کے دیئے ہوئے زخم پھر ہرے ہو جائیں گے اور شاید اُن کا مقابلہ کرنے کی میں اپنے آپ میں ہمت ہی نہ رکھتا تھا۔

مینا نے گہری نظروں سے مجھے دیکھا اور ذرا بلیباک لہجہ میں مجھ سے پوچھا:۔

"میرے سوال کا جواب خاموشی کے سوا کچھ اور بھی ہو سکتا ہے؟" اس کے لہجہ میں ذرا تلخی تھی جو اپنی تمام الجھنوں کے باوجود میں محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے نظریں اٹھا کر بھرپور انداز میں اسے دیکھا۔ وہ برف ہو چکی تھی۔ میں اس وقت پیار اور اس کے فلسفے کے متعلق قطعی طور پر کچھ کہنے کے لیے تیار نہ تھا۔

مینا نے مجھے جیسے اپنا آخری فیصلہ سُنا دیا۔ "ہمارا اس طرح ملنا ناجائز بھی ہے اور ناممکن بھی۔"

"تم کیا چاہتی ہو؟" میں نے کچھ بیزاری سے پوچھا۔

"شادی" اس نے ایک ہی لفظ میں سارا مضمون ادا کر دیا۔

"پیار نہیں" میری سنجیدگی میں محبت کی ہلکی سی نرمی بھی نہیں تھی۔

"پیار بھی" وہ مسکرانے لگی۔

میرے رویے میں ایک دم نرمی عود کر آئی۔ اور پھر خود بخود ایک ہلکی سی

مسکراہٹ نمودار ہو گئی ۔ اب ہم دونوں پھر رومان پرور ماحول میں کھو چکے تھے ۔

مینا نے مجھے کہا تھا آپ دس بجے آجائیں ۔ اور دس بج ہی نہ رہے تھے ۔

میں نے سوٹ پہننے سے پہلے بنیان اور قمیض پر علیحدہ علیحدہ اعلیٰ قسم کے سینٹ استعمال کیے ۔ رہی سہی کسر میں نے اپنے دلپسند سوٹ پر نکال لی ۔ پھر وہی انگلی میں نے اپنی چھوٹی چھوٹی مونچھوں پر پھیر لی ۔ رومال سے بھی نہایت اعلےٰ مہک آرہی تھی لیکن میں اس مہک کو بھول کر اس کی یادوں کی مہک سے مسحور ہو رہا تھا ۔ حسین یادوں کی مہک مجھے اپنی طرف مسلسل کھینچ رہی تھی اور گھڑی پر ابھی تک دس نہیں بجے تھے ۔ میں اپنی کلائی کی چھوٹی گھڑی کو بڑی بے تابی سے بار بار دیکھتا رہا ۔ سوئی تو جیسے وہیں جم گئی تھی ۔ مجھے ذرا سا افسوس ہوا کہ میں نے کیوں اپنے آنے کے متعلق پوچھ لیا تھا ۔ میں صبح ہی صبح وہاں پہنچ جاتا ۔ رات ہی کیا کم بے چینی سے کٹی تھی جو اب دس بجنے کا انتظار کرنا پڑ رہا تھا ۔

میں جب وہاں پہنچا تو ابھی دس نہ بجے تھے ۔ راستے میں میری رفتار شاید معمول سے کچھ زیادہ ہی تیز رہی تھی ۔ اس نے مسکراتے ہوئے میرا خیر مقدم کیا ۔ غیر ارادی طور پر میری نظر کلائی کی گھڑی پر ذرا دیر کے لیے رک گئی ۔ میں نے کہا ۔

"دس ہی نہیں بج رہے تھے ۔"

"آپ نے آجانا تھا ۔"

"حکم کا احترام بھی تو ضروری تھا ۔"

"آج تو بڑے عقیدت مند بنے بیٹھے ہیں۔"

"دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔"

"آپ کے کتنے دل ہیں؟"

"تمہارا کیا خیال ہے؟"

"کافی ہوں گے"

"اس عزّت افزائی کا شکریہ"

"بُرا مان گئے۔"

"یہ مجال"

اس نے پیار سے مجھے دیکھا۔ میرا جی چاہا اس کا ہاتھ پکڑ کر چوم لوں۔ مگر میں تو اپنے آپ کو مستقل مزاج بنانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ ضبط کا کہاں تک امتحان لیتا۔ میں کچھ آگے بڑھا۔ وہ انجانے میں پیچھے ہٹ گئی۔ میں نے پیار کی بھرپور نظر اس پر ڈالی۔ کتنی خوبصورت لگ رہی تھی وہ۔ اس نے دھانی رنگ کی شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ اسی رنگ کے دوپٹے میں اس کے حسن کی چاندنی دل پر سحر طاری کر رہی تھی۔ میں سراپا اس کے حسن میں گم ہو گیا۔ وہ انگڑائی لینے کے انداز میں میری طرف بڑھی۔

"آپ کن خیالوں میں کھو گئے۔"

"بے حد حسین خیالوں میں۔"

"کسی حسینہ کے؟"

"ہاں"

"کون ہے وہ خوش قسمت"

"ایک ہے۔"

"مجھے نہیں بتائیں گے؟"

"کیا کرو گی جان کر"

"اسکی پوجا کروں گی۔"

"کیوں؟"

"میں محبت کی پجارن ہوں۔ پیار میرا مذہب ہے۔"

"اور پیار کرنے والے۔"

"وہ میرے دیوتا"

"سب جھوٹ"

"ثبوت؟"

"اپنے دل سے پوچھو۔"

"کوئی آواز نہیں۔"

"یہی تو دُکھ ہے۔"

"آپ کو بھی دُکھ ہیں۔"

"مصیبت تو یہ ہے تمہارے پاس دل نہیں۔"

"واقعی" وہ میرے اور قریب ہو گئی۔

اس کے حسین لبوں سے مسکراہٹ کی چاندنی اکناف میں چھن چھن کر پھیل رہی تھی۔ مجھے تو یوں محسوس ہوا جیسے بہاریں جوبن پر آگئی ہوں۔ اس

کی باتوں میں پھولوں کی سی مہک تھی ۔ اس کے انداز میں کلیوں کی سی چٹک تھی اس کی اداؤں میں بہاروں کا حسن تھا ۔ اس کے سراپا میں ، حسین رنگوں کا کیف تھا ۔ وہ اس دھانی لباس میں میرے دل کی راجدھانی پر راج کر رہی تھی ۔ میں خوابوں کے جزیروں میں کھو گیا ۔ اس نے جیسے سرگوشیانہ انداز میں مجھ سے پوچھا :-

"آپ بار بار کھو سے کیوں جاتے ہیں ۔"

میں نے اپنے آپ کو سنبھالا ۔ اس نے پھر کہا :-

"کسی کی یاد ستاتی ہو گی ؟"

"تمہیں مجھ پر اعتماد کیوں نہیں ۔"

"آپ یقین جو نہیں دلاتے ۔"

"کیسے دلاؤں ۔"

"مجھے کیا پتہ ۔"

"مجھے سمجھنے کی کوشش کرو "

"آپ تو معمہ ہیں "

پھر وہ سوچوں کے سمندر میں غوطہ لگا گئی ۔ میں نے اس کے چہرے کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کی مگر میرا علم اتنا وسیع ثابت نہ ہوا ۔ مجھے اپنے اندازے پر بھروسہ نہیں تھا ۔ میں اسے چپکے چپکے دیکھتا رہا ۔ اس کے حسن کی ہلکی ہلکی تپش میرے دل میں پیار بھرے شرارے اور نئی نئی امنگیں پیدا کرتی رہی ۔ میری پیاس بڑھتی ہی جا رہی تھی ۔ میں نے یوں محسوس کیا کہ میں

اس کی محبت میں بری طرح پھنس گیا ہوں ۔ چند دن پہلے تک مجھے یقین تھا کہ یہ محض اُنس ہے ۔ یا پھر ایسا پیار جو ایک حساس دل کے لیے ناگزیر ہے ۔ مگر یہ نہیں پتہ تھا کہ یہ دیوانگی کی حدیں پھلانگ جائے گا ۔ مجھے محبت میں دیوانگی کی کیفیات سے بڑا ڈر لگتا تھا ۔ میں نے اس انجانے خوف کے متعلق کبھی نہ سوچا تھا ۔ شاید اس کی وجہ وہ سیاہ داغ ہوں جو عتیق کی بیوفائی نے میرے دل پر نقش کر دیئے تھے ۔ یہ داغ اب بھی کبھی کبھی جلنے لگتے تھے اور مینا کا حسین پیار ان کے بجھنے میں معاون ثابت ہوتا ۔

میں نے مینا کو چھونے کی کوشش کی وہ چونک اٹھی ۔ میں ہنسنے لگا ۔

" بس ڈر گئیں ؟ "

" مجھے آپ سے ڈر لگتا ہے ۔ "

" بس یہی تم میں اور مجھ میں فرق ہے ۔ تمہیں مجھ سے ڈر لگتا ہے ۔ مجھے تم پر پیار آتا ہے ۔ اپنا اپنا دل ہے ۔ "

" آپ مجھ سے پیار کرتے ہیں ؟ "

" میں اپنے جرم کا اعتراف کرتا ہوں ۔ "

اس نے بڑے پیار سے مجھے دیکھا ۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں ۔ اس کے گالوں پر سرخی کی بڑی پیاری سی لہر دوڑ گئی ۔ میں نے جذباتی ہوتے ہوئے کہا :-

" تم مجھے اتنی پیاری کیوں لگتی ہو ۔ "

وہ سمٹ کر رہ گئی ۔ اس کے حسن کے کئی رنگ تھے ۔ کبھی وہ چھوئی موئی

سی بن جاتی۔ کبھی اس کی شخصیت پر سادگی کی ایک جھلک نمایاں ہو جاتی، کبھی پُر کاری اس کی جبلت کی تہہ سے ابھر آتی۔ میں بھنور میں پھنس جاتا اور وہ مسکرا مسکرا کر مجھے دیکھا کرتی۔

ہم کافی دیر سے اکٹھے بیٹھے تھے۔ اس نے میری طرف دیکھا اور پھر میز پر پڑی پنسل سے کھیلنے لگی۔ پھر میری طرف دیکھا اور دیکھتی ہی رہ گئی۔ میں نے کہا۔

"کوئی بات تو کرو"

"کیا بات کروں"

"اپنے مہمان کی دلبستگی کے لیے کچھ تو کہو۔"

"میرے پاس کہنے کو کچھ رہا ہی نہیں"

"کیوں"

"میرا سب کچھ تو مہمان لوٹ کر لے گیا"

اور میں پھر حُسن کی دنیا میں گم ہو گیا۔ حُسن کہیں بھی ہو کتنا دلفریب ہے۔ مجھے کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ میں نے آنکھوں سے اسے چوم لیا۔ وہ شرما کر رہ گئی۔ میرا دل پھول کی طرح کھل اٹھا۔ اس نے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا پھر پلکیں گرالیں۔ میرا دل بے قابو ہوتا جا رہا تھا۔ میں اٹھ کر چلا آیا۔

○

میں نے پیار کی وسعت اور عمق کی جو حدیں اپنے ذہن میں متعین کی تھیں وہ

حدیں خلاف توقع عمیق ترین اور وسیع تر ہوتی گئیں۔ رومان کے لطف کے ساتھ ساتھ ایک مبہم سی خلش تھی جس کے متعلق میرے ذہن میں کوئی واضح تصور نہ تھا۔ جب میں اسے ملتا تو یہ خلش بالکل ہی معدوم ہو جاتی۔

میں دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھ گیا۔

ہم میں تکلف برائے نام ہی رہ گیا تھا۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ ہم ابھی تک محبت کے اس پردے سے بالکل آزادانہ ہوئے تھے جو آزاد خیالی کا تقاضہ ہے۔ اور یہ بھی ہے کہ ہم دونوں زمانے کی نسبتاً اپنے آپ کو کافی آزاد خیال سمجھتے تھے۔ صرف نظریات کی حد تک۔ پھر بھی ہلکی سی ایک جھجک سی تھی جو مشرقیت کا طرۂ امتیاز ہے اور جس پر ماحول کا کچھ نہ کچھ اثر ہونا لابدی چیز ہے۔ میں نے اب کی اس کے پاس آنے کے لیے اجازت لینے کی دانستہ کوشش نہ کی تھی۔ شاید اس میں موڈ کو بھی کچھ دخل ہو۔ میری یہ جسارت کچھ بیباک سی تھی۔ میں نے آخری سیڑھی ختم کرنے کے بعد سانس روک کر اندر جھانکا۔ بینا کرسی کی پشت پر سر رکھے ٹانگیں میز کے نیچے پھیلائے نیم دراز تھی۔ اس کے تازہ میک اپ کی دھیمی دھیمی خوشبو مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ اس نے سرخ رنگ کی چوڑی پھالوں والا تنگ قمیض پہن رکھا تھا۔ چوڑی پھالوں کے ساتھ ساتھ ہلکی زمین پر باریک لکیریں بڑی ہی دلفریب نظر آرہی تھیں۔ اس کے پشت پر جھکنے سے تنگ قمیض جسم پر بالکل چپک کر رہ گیا تھا۔ سفید شلوار پر قمیض کا سرخ رنگ اور بھی شوخ نظر آرہا تھا۔ دوپٹہ کھسک کر کرسی کی پشت پر جا گرا تھا۔ وہ کسی بڑے آرٹسٹ کی حسین ترین تصویر نظر آرہی تھی۔

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ دوسری مرتبہ اندر جھانکا۔ تو وہ گھبراہٹ میں جلدی سے اٹھی۔ وہ ننگے سر ہی دروازے کی طرف بڑھی۔ اس کے سر کی پشت پر سیاہ بالوں کا گول سا دائرہ بڑا ہی خوبصورت نظر آ رہا تھا۔ میری نظریں وہاں سے پھسل کر اس کے سینے کے زیر و بم پر آ رکیں۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ کی حسین چاندنی پھیل گئی۔

" او آپ "

میں مسکرانے لگا۔ ایک ثانیہ کے لیے اس کے چہرہ پر سنجیدگی نمودار ہوئی۔

" میں تو ڈر گئی تھی "

" کیوں ۰

" مجھے تنہائی سے ڈر لگتا ہے۔"

" تم تنہا کب تھیں "

" اور کون تھا میرے پاس "

" جس کے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھیں "

وہ ہنسنے لگی۔ اس کی ہنسی میں ایک دلآویز ترنم تھا۔

" آپ نے ٹھیک اندازہ لگایا "

" ہم تو سبھی دلوں کی دھڑکن سمجھتے ہیں۔ مریض عشق کے دل کی دھڑکنیں ہمیں سب کچھ بتا دیتی ہیں۔"

" سب کچھ جانتے اور سمجھنے کے بعد بھی آپ مریض کو دوا نہیں دیتے کتنے سنگدل ہیں آپ "

"دعا تو دیتے ہیں۔ درویشوں کے پاس اور ہے ہی کیا۔"

"آپ کب تک مجھے یونہی ستاتے رہیں گے۔"

"جوگیوں پر ایسے الزام نہیں لگایا کرتے"

"کچھ جوگن کے متعلق بھی سوچا آپ نے؟"

"کیا"

"جوگن کا ردگن کیسے دور ہو وت"

ہم دونوں ہنس پڑے۔ کتنے بھولپن اور پیار میں ڈوب کر اس نے یہ مصنوعی الفاظ ادا کیے تھے۔ اس کی یہ ادا میرے دل کو بھا گئی۔ میں نے جیسے نشہ کی حالت میں اس کو دیکھا۔ اس نے میری آنکھوں پر آہستہ سے ہاتھ رکھ دیا۔

"آپ اس طرح نہ مجھے دیکھا کریں۔"

"پیار کسی کے بس کی بات ہے مینو"

"آپ کو اتنا ہی پیار ہے تو مجھے اپنا بنا کیوں نہیں لیتے۔"

"اپنا ہی تو بنایا ہے"

"اس طرح نہیں"

"اور کیسے؟"

"شادی"

"تمہیں شادی کی اتنی جلدی کیوں ہے"

"مجھے ایسا لگتا ہے جیسے آپ مجھے چھوڑ جائیں گے۔"

"یہ وہم ہے تمہارا"

"آپ اس وہم کو دور کیوں نہیں کر دیتے"

"تمہیں کیسے یقین دلاؤں"

"شادی سے" وہ مسکرا دی

میں خاموش ہو گیا۔ وہ مجھے یوں دیکھنے لگی جیسے میں کوئی اجنبی ہوں۔ مایوسی کی ایک ہلکی سی لہر اس کے چہرے پر دوڑ گئی۔ میں نے اس کے دل کی کیفیات کا اندازہ تو لگا لیا۔ لیکن میں اسے ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا۔ میرے سامنے سوچوں کی وسعتیں پھیل گئی تھیں۔ میں ان کی حدیں تلاش کرتا رہا۔

○

گلی میں چلتے چلتے میں نے اوپر جھانکا وہ چھجے پر کھڑی مجھے تشکر آمیز نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے یاقوتی ہونٹوں پر پیار بھری مسکراہٹ میرا خیر مقدم کر رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ نے میرے دل میں مسرتوں کے چراغ روشن کر دیئے تھے۔ وہ جلدی سے آدھی سیڑھیاں نیچے اتر آئی آج کے خیر مقدم میں کتنا خلوص، کتنا پیار تھا۔ مجھے قریب دیکھ کر وہ پھر جلد جلد سیڑھیاں چڑھ گئی۔ میں بھی زینہ پھلانگتا اس کے پیچھے بھاگا۔ اس نے مجھے بڑے پیار سے اپنی کرسی پیش کی۔ خود وہ ٹانگیں لٹکا کر میز پر بیٹھ گئی۔ اس کے لبوں پر ابھی تک مسکراہٹ کھیل رہی تھی میں نے بھر پور نظریں اس پر جما دیں۔ آج اس نے ایک خاص اہتمام کے ساتھ کپڑے پہن رکھے تھے۔ پھول دار ریشمی فراک اور اسی سے میچ کرتا ہوا آسمانی رنگ کا دوپٹہ اور شلوار۔ میک اپ میں بڑی دلکش چمک اور مہک تھی۔

چاند کی طرح دمک رہی تھی۔ وہ میرے کتنے قریب تھی۔ میرا یہ احساس ہی کتنا جاں فزا تھا۔

میری نظروں میں پیار کی حدت بڑھتی ہی گئی۔ وہ بھی آج بہت خوش تھی۔ ہمیں خود بخود، بغیر کچھ کہے بغیر کچھ سنے، یقین ہو گیا تھا کہ آج ہم ایک دوسرے سے قطعی رنجیدہ نہ ہوں گے۔ ہم نے آج کوئی ایسا موضوع ہی نہیں چھیڑا تھا جس میں اختلافات کی گنجائش ہو۔ یہ احساس خود بخود ہی پیدا ہو گیا تھا۔ اس کی کوئی خاص بنیاد نہیں تھی اگر تھی تو ہمارے ذہن میں واضح نہیں تھی۔ یا ہم اسے بالکل ہی نہ سمجھ سکے تھے۔

میں نے اسے کہا:۔

"آج تو بلا کی حسین نظر آ رہی ہو مینو۔ تمہاری قسم، اگر میں نے ذرا بھی مبالغہ کیا ہو۔ لیکن یہ بتاؤ آج کہاں پر چڑھائی کا ارادہ ہے۔ کوئی خاص منزل ہے؟ آخر کیا ارادے ہیں؟"

میں بولتا رہا اور وہ مسکراتی رہی۔ ہنستی رہی۔ میں کبھی پیار سے اسے دیکھنے لگتا۔ کبھی کچھ نہ کچھ کہنے لگتا۔ وہ صرف مسکرائے جاتی تھی۔ میں نے کہا۔

"آخر آپ بھی کچھ گوہر افشانی کریں۔ کب تک ہمیں ریڈیو سمجھتی رہیں گی۔ آپ تو سوچ آن کر کے بیٹھ گئی ہیں۔"

"میرا جی آج آپ کی باتیں سننے کو چاہتا ہے۔ بس آپ موتی بکھیرتے جائیں۔"

"تم نے واقعی مجھے ریڈیو تصور کر لیا۔"

"آپ کی قسم یہ بات نہیں۔ میرا جی چاہتا تھا آپ آئیں اور میٹھی میٹھی باتیں

کریں۔ آپ کی باتوں میں کتنا پیار ہوتا ہے۔ کتنا خلوص ہے۔ کبھی کبھی ماضی میں میرا رویہ ایسا رہا ہے جس سے کچھ تلخی پیدا ہو جاتی رہی ہے۔ میں فی الحقیقت پشیمان بھی ہوں اور شرمندہ بھی۔ معذرت خواہ بھی ہوں اور معافی کی خواستگار بھی۔ اب میں آپ سے کبھی نہیں لڑوں گی۔ آپ بھی وعدہ کریں کہ آپ مجھ سے کبھی جھگڑا نہیں کریں گے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں"

"نہیں آپ مجھے لکھ کر دیجئے تاکہ انتہائی غصہ کے عالم میں آپ کی یہ تحریر آپ کو پڑھا دی جائے۔"

"مجھ پر اعتماد کرو۔ مینو"

"مجھے اعتماد ہے لیکن جب انسان غصہ کے عالم میں ہوتا ہے وہ سب، کچھ بھول جاتا ہے۔ اپنے اصول بھی اور وعدے بھی"

بھئی خوب آج تو تم فلسفی بنی بیٹھی ہو۔"

"جی ہاں آپ جیسے دانشوروں سے دوستی ہو، پھر بھلا کوئی فلاسفر کیوں نہ بنے۔"

"اس ذراسی نوازی کا شکریہ"

وہ ہنستے ہنستے دوہری ہو گئی۔

"ذرہ نوازی کی اصطلاح کو ذراسی نوازی بنا دیا۔ کمال ہیں آپ بھی۔ بظاہر آپ کتنے سنجیدہ بنے پھرتے ہیں۔ کوئی اجنبی دیکھے تو سمجھے بقراط ہیں۔ قریب ہو کر دیکھے تو پتہ لگے حضور طنز و مزاح کا مرقع ہیں۔ شرارت کے پتلے ہیں۔

ظرافت گھٹی میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔"

" اس عزت افزائی کا شکریہ۔ کچھ اور ارشاد فرمایئے۔ واللہ لطف آگیا۔"

" یہی کافی ہے وہ مسکرانے لگی

" آپ نے جو کچھ فرمانا ہے بے دھڑک فرماتی جائیں۔ میں ہمہ تن گوش ہوں۔"

" لوجی میں تو چپ ہوگئی۔"

" نہیں نہیں فرمایئے۔ فرماتی جائیں۔ کیا تھک گئیں؟ پان پیش کروں۔ خوش قسمتی سے میری جیب میں ہی ہے۔"

" جب میں چپ تھی تو ارشاد ہوا کچھ کہو۔ کچھ کہنا چاہا تو زبان کاٹ دی۔ یہی تو وہ ادائیں ہیں جن کی وجہ سے لڑکیاں آپ پر مرتی ہیں۔"

" پھر فرمایئے۔ واللہ مزہ آگیا۔ یہ تو خوب انکشاف ہوا کہ لڑکیاں ہم پر مرتی ہیں۔"

" بس اور نہ بنیے آپ اتنے بھولے بھی نہیں مجھے نوید سب کچھ بتا چکی ہے۔"

" کیا؟"

" آپ کی آدھی کلاس فیلو آپ کو چاہتی ہیں۔ میں بھلا جانتی ہی نہیں۔"

" کیوں مجھے بیوقوف بنا رہی ہو۔"

" بے وقوف تو آپ مجھے بنا رہے ہیں۔"

" اچھا چھوڑو اس بحث کو لو یہ پان کھاؤ۔"

میں نے پان پیش کیا۔ وہ پان لے کر شکریہ ادا کرنے کے بعد کھانے لگی۔

اس ذراسی چیز نے اس کے حسن میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "یہ تو بتاؤ آج جا کہاں رہی ہو۔"

اس نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا۔ پھر مسکرانے لگی۔ پھر سنجیدہ ہو گئی۔

"آپ کو کس نے کہا۔"

"کیا؟"

"کہ میں کہیں جا رہی ہوں۔"

"آپ کی حسن آفرینی اور جلوہ سامانیوں نے"

وہ ہنسنے لگی

"آپ بھی حد کرتے ہیں"

"حد کہاں میں تو ابتدا کر رہا ہوں۔"

"آپ میری بات کو گول کیوں کر رہے ہیں۔ آخر آپ بتاتے کیوں نہیں" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیا؟"

"لڑکیوں کے فریفتہ ہونے والی بات۔"

"کیا میں کسی کو فریفتہ ہونے سے منع کر سکتا ہوں۔"

"تو پھر یہ بات ٹھیک ہوئی نا؟"

"پگلی ہو۔ ہٹاؤ یہ قصہ۔ یہ بتاؤ آج کدھر کے ارادے ہیں۔"

کہیں بھی نہیں۔ آپ کو کیا شک ہے" اس نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

"میں تو یہی سمجھا تھا آج جو اتنی بنی ٹھنی بیٹھی ہو کوئی خاص پروگرام ہو گا۔"

"آپ کی قسم کوئی خاص پروگرام نہیں ہے۔ مجھے پتہ تھا آج آپ آئیں گے۔"

"وہ کیسے؟ میں تو بتا کر نہیں گیا تھا۔"

"جب آتے ہیں تو مجھے پتہ چل جاتا ہے۔"

میں بڑا حیران ہوا۔ چند لمحے میں اس معمہ کے متعلق سوچتا رہا کہ اسے کیسے پتہ چل جاتا ہے۔ عام طور پر میں جمعہ کو آیا کرتا تھا۔ آج جمعہ ہوتا تو اندازہ لگانا آسان تھا۔ کیونکہ یہ میرا معمول تھا۔ اس کے علاوہ بھی میں کبھی کبھی آجاتا تھا۔ اور آج تو منگل تھا اور کل ہی میں اسے مل کر گیا تھا پھر بھلا وہ کونسا اشارہ ہو سکتا تھا جو اس کی اس معاملے میں راہنمائی کر سکتا تھا۔ میرے لیے یہ اچھا خاصہ معمہ بن گیا اور وہ میری طرف دیکھ دیکھ کر برابر مسکرائے جا رہی تھی۔ میری اس پریشانی نما کیفیت پر وہ بہت محظوظ ہو رہی تھی۔ میں واقعی گورکھ دھندے میں پھنس گیا تھا اور اس لئے یہ خود بخود تفریح کا سامان پیدا ہو گیا تھا۔ میں نے ایسی نظروں سے اسے دیکھا جن میں ایک التجا سی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا وہ مجھے اس الجھن سے نجات دلا دے۔ لیکن وہ اور بھی محظوظ ہونے لگی۔ میں نے سر کو ایک جھٹکا دیا۔ ہٹاؤ یار نہیں پتہ لگتا تو نہ سہی ایسی کون سی خاص بات ہے۔ خواہ مخواہ دماغ کو تھکانے کی کیا ضرورت ہے۔

میں ابھی تک بہت خوش خوش بیٹھا رہا تھا۔ یہی چند لمحے تھے جن میں میں کچھ دیر کے لیے الجھ گیا تھا۔ بہرحال اسے پریشانی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ میری طبیعت سے یہ ہلکا سیاہ بادل خود بخود ہٹ گیا۔ اب میں پھر خوش تھا۔ میرا جی چاہتا تھا میں ذرا اسے چھیڑوں۔ مجھے وہ بڑی ہی پیاری لگ رہی تھی اور

میں اسے کچھ ستانا بھی چاہتا تھا۔ لیکن اس خیال سے کہ پھر کہیں کوئی ایسی بات پیدا نہ ہو جائے جس سے ہم دونوں کچھ دیر کے لیے پریشان ہو جائیں۔ میں نے اپنا یہ ارادہ بھی ترک کر دیا۔

ہم دونوں آج حسبِ سابق کی نسبت خوش تھے۔ میں نے اسے کہا۔

"چلو آج پکچر چلتے ہیں۔ تمہاری قسم بڑا پیارا پروگرام رہے گا۔ دیکھو انکار نہ کرنا ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گا۔"

"میں کیسے جا سکتی ہوں" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیوں؟" میں سناٹے میں آ گیا۔

"امی کو کیا کہوں گی۔"

"کوئی بہانہ بنا لو" میرا ذرا موڈ بدلا

"مجھے تو بہانہ بنانا آتا نہیں۔"

"اتنی سیدھی تو نہیں ہو۔"

"اس نئے ریمارک کا شکریہ"

"تم ایک ڈاکٹر ہو کر امی سے کالج کی لڑکیوں کی طرح اجازت لیتی ہو۔ بھئی کمال ہے۔"

آپ کو یاد ہو گا میں جناب کی خدمت میں کئی مرتبہ عرض کر چکی ہوں کہ وہ میری امی بھی ہیں اور سہیلی بھی۔ اس لیے میں ان کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچا سکتی۔"

"کمال ہو بھئی اس میں بھلا اعتماد کو ٹھیس پہنچانے والی کون سی بات ہے۔ کہہ دو کوئی فنکشن ہے۔ یا کسی سہیلی کے ہاں جا رہی ہوں۔"

" اچھا۔ آپ کے لیے پتہ نہیں مجھے کیا کیا کرنا پڑے گا۔ لیکن ابھی تو بہت وقت باقی ہے۔"

" تم چلو تو کچھ شاپنگ کرتے ہیں۔ کچھ گھومیں گے۔ پھر کافی پئیں گے۔ تب تک پکچر کا وقت ہو جائے گا۔"

" نہیں اس طرح تو بہت دیر ہو جائے گی۔ آپ سینما میں میرا انتظار کریں۔ میں وہاں پہنچ جاؤں گی۔"

پروگرام طے ہونے کے بعد میں وہاں سے چلا آیا۔ کھانا ایک ہوٹل سے کھایا۔ اس کے بعد یونہی کبھی ادھر کبھی ادھر گھومتا رہا۔ ابھی کافی وقت باقی تھا اور میں بہت بور ہو رہا تھا۔ میں کافی ہاؤس چلا گیا۔ کافی پی۔ وہاں ایک دوست مل گیا۔ اس سے کچھ گپ شپ رہی۔ مگر اس گپ شپ میں ذرا مزا نہ آیا۔ مجھے اپنے دوست کی رفاقت ایک بوجھ سا محسوس ہو رہی تھی۔ میں وہاں سے بھی اٹھ آیا۔ کچھ دیر ایک بارونق سڑک کے فٹ پاتھ پر گھومتا رہا۔ مگر آج تو دلہن کی طرح سجی ہوئی یہ سڑک بھی اچھی نہ لگ رہی تھی۔ میں تانگے پر بیٹھ کر سینما پہنچ گیا۔ ابھی تک کافی وقت باقی تھا۔ صرف سب سے نچلے درجے کے ٹکٹ لینے والے کھڑکی کے سامنے ٹیڑھی میڑھی قطار بنائے کھڑے تھے۔ میں سینما کی ڈیوڑھی میں ٹہلنے لگا۔ جب ٹہلتے ٹہلتے بور ہو گیا تو جالی کے اندر چسپاں تصویروں کو دیکھنے لگا۔ ان کو دیکھ کر فلم کے کچھ منظر اور کہانی کی کچھ نہ کچھ سمجھ آجاتی تھی۔ مگر مجھے تو ایسے لگ رہا تھا جیسے میں کچھ بھی نہیں دیکھ رہا ہوں۔ میں پھر ٹہلنے لگا۔ اور اِدھر سے اُدھر۔ اُدھر سے اِدھر آتے جاتے میں ہر بار سڑک کی

طرف مضطرب نگاہ اٹھا کر دیکھتا۔ مینا ابھی تک نہیں آئی تھی۔ اور میں سوچ رہا تھا کہیں ایسا نہ ہو وہ آ ہی نہ سکے یا دانستہ نہ آئے۔ میں کچھ پریشان سا ہو گیا۔ پاس ہی گیٹ کے برابر گیٹ کیپر کی کرسی پڑی تھی میں اس پر بیٹھ گیا۔ اور ٹکٹکی باندھے سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔ اب تو بہت کم وقت رہ گیا تھا اور وہ آ ہی نہ رہی تھی۔ اور اور تانگے موٹریں آ رہی تھیں۔ میں نے اسے حدِ نظر تک بار بار دیکھا۔ وہ کہیں بھی نہیں تھی۔ کبھی میں اٹھ کر سڑک تک آ آتا۔ کبھی پھر گیٹ کیپر کی کرسی پر جا بیٹھتا۔ یہ انتظار تو ایک قیامت تھا اور وہ ابھی تک نہیں آئی تھی میں نے سوچا کہیں وہ لیڈیز ویٹنگ روم میں نہ بیٹھی ہو۔ باہر کھڑے ہو کر دروازے سے میں نے کچھ باریک باریک سُریلی سی آوازیں سُنیں۔ اور پھر گھبراہٹ اور بے چینی میں پردہ اٹھا کر اندر جھانکا۔ اندر بیٹھی ہوئی عورتیں جلدی جلدی اپنے آپ کو کپڑوں میں سمیٹنے لگیں۔ ناگواری کے کچھ اثرات میں نے ان کے چہروں اور انداز سے محسوس کیے۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ آیا۔ وہ اندر بھی نہیں تھی۔

اُوپر کی کلاس کا بکنگ کلرک مجھے دیکھ کر پوچھنے لگا۔ "آپ کو کسی کا انتظار ہے؟" میں نے کہا "میری فیملی آنے والی تھی۔" اور پھر میں آپ ہی اس جھوٹ پر شرمندہ سا ہو گیا۔ جلدی میں جو کچھ میرے منہ سے نکلا کہہ دیا۔۔۔ لیکن یہ بھی تھا اگر کہہ دیتا میرے دوست آنے والے ہیں اور بعد میں پھر اس کی نظر پڑ جاتی تو کوئی اچھا تاثر پیدا نہ ہوتا بلکہ شکوک میں اضافہ ہوتا۔ اس لحاظ سے یہی ایک اچھا جھوٹ ہو سکتا تھا۔ جو بغیر سوچے سمجھے میں نے بول دیا تھا۔ اس کے آنے سے پہلے ہی میں نے اچھی جگہ کا انتخاب کرنا چاہا۔ اسی خیال سے

میں نے بوکس کے لیے پوچھا۔ بدقسمتی سے کوئی بھی خالی نہ تھا۔ ایک بوکس پہلے سے ریزرو نہیں تھا لیکن اس میں منیجر صاحب کے مہمان آ گھسے تھے۔ میں نے سوچا چلو اپر کلاس تو ہے ہی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اتنے میں ایک تانگا باہر کے گیٹ پر کھڑا ہوا۔ میں نے فوراً اس طرف دیکھا۔ مینا کے ساتھ نوید بھی تھی۔ نوید نے پھولدار ریشمی شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ مینا نے کھلے گلے کا جمپر اور دھانی رنگ کی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ پاؤں میں دونوں نے اونچی ایڑی کے سرخ سینڈل پہن رکھے تھے۔ سیاہ فریم کے کاگل دونوں کی آنکھیں چھپائے ہوئے تھے۔ میں اُن کو دیکھ کر جلدی سے آگے بڑھا اور اُن کو اپر کلاس کے دروازے پر کھڑا کر کے ٹکٹ لینے چلا گیا۔ بکنگ کلرک نے مجھے پوچھا یہ ڈاکٹر ہے۔ میں نے جلدی میں اثبات میں سر ہلایا اور ٹکٹ لے کر ان کی طرف بڑھا۔ مجھے مزید کچھ سوچنے کا موقعہ ہی نہیں ملا۔

اندر ہال تقریباً خالی تھا۔ صرف نچلا درجہ آہستہ آہستہ بھر رہا تھا۔ درمیانے درجے میں بھی چند لوگ نظر آ رہے تھے۔ اپر کلاس میں کوئی نہ تھا۔ ہم تینوں ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ میرے بائیں ہاتھ مینا بیٹھی۔ اس کے ساتھ نوید تھی۔ فلم بڑی کامیاب رہی تھی۔ مگر اب وہ اپنی جوبلی منا چکی تھی۔ اس کا آخری ہفتہ تھا۔

"اچھی سی ملاقات کرنا ہو تو ایسی تنہائی خوب مزا دیتی ہے۔" مینا نے یہ نکتہ مجھے سمجھایا۔ مجھے یہ بات پہلے کبھی نہ سوجھی تھی۔ واقعی کسی دوست کے ساتھ پکچر دیکھنا ہو تو اس وقت جائے جب فلم اترنے والا ہو۔ میں مینا کے ذہن کا معتقد ہو گیا۔ میں تو صرف اس خیال سے آ گیا تھا کہ میں نے وہ فلم ابھی تک نہ دیکھا تھا۔

پھر فلم دیکھنا میرا مقصد بھی نہ تھا۔ مجھے تو صرف مینا کی قربت کی ضرورت تھی۔ فلم شروع ہونے سے پہلے دو آدمی اور ایک عورت اندر داخل ہوئے جو دوسرے کونے میں جا دبکے۔ ان کے اندر داخل ہوتے وقت میرے چہرے پر ایک لمحہ کے لیے جو ناگواری کے اثرات پیدا ہوئے تھے وہ ان کے دور بیٹھنے پر اسی لمحہ معدوم ہو گئے۔

فلم شروع ہو چکا تھا۔ میں فلم کو کم اور مینا کو زیادہ دیکھتا رہا۔ مجھے تو کوئی بھی سین مزا نہ دے رہا تھا۔ حالانکہ جو کچھ میں نے اس فلم کے متعلق سنا یا اخبارات میں پڑھا تھا اس میں اس کی بڑی تعریف کی گئی تھی۔ مینا فلم دیکھنے میں محو تھی۔ کبھی کبھی وہ بھی میری طرف دیکھ لیتی تھی۔ نیم تاریکی میں دو ایک بار نظروں کا ٹکراؤ بھی ہوا۔ میں نے اسے چھیڑنا چاہا۔ اس نے سرگوشی میں مجھے کہا۔

"کچھ تو خیال کیجئے، ساتھ نوید بیٹھی ہے"

"لیکن تم مجھے بھول کر فلم کو اتنی اہمیت کیوں دے رہی ہو۔!"

ہماری کھسر پھسر سن کر نوید نے پوچھا

"کیا بات ہے؟"

"اپنے کلاس فیلو سے پوچھو" مینا نے برجستہ کہا اور میں کچھ جھینپ سا گیا۔

میرا ہاتھ وہیں رک گیا مگر یہ رکاوٹ زبردستی کی تھی۔ میری بے چینی میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ میرا جی چاہا میں مینا کا ہاتھ پکڑ کر ذرا سا دبا دوں۔ نیم تاریکی میں میں نے اندازہ لگایا اس کا ہاتھ اس وقت کہاں ہوگا۔ پھر میں نے اکناف کا جائزہ لینا چاہا۔ گردن کو گھما کر پیچھے دیکھا تو ایک آدمی اور ایک عورت بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے آنے کا ہمیں پتہ ہی نہ چلا تھا۔ جب ذرا روشنی پڑی تو میں نے

غور سے دیکھا۔ یہ تو وہی بکنگ کلرک تھا جس سے میں نے ابھی ٹکٹ خریدے تھے۔ اور یہ اس کے ساتھ عورت کہاں سے آگئی۔ عجیب سا معاملہ تھا۔ فلم تیزی سے ختم ہوتی رہی۔ انٹرول ختم ہونے سے کچھ دیر پہلے میں نے پھر پیچھے دیکھا۔ بکنگ کلرک اور اس کی ساتھی عورت دونوں کہیں جا چکے تھے۔

انٹرول میں ہم نے چائے پی۔ بڑی بے مزا چائے تھی۔ یا شاید میں نے ایسا محسوس کیا ہو۔ مینا اور نوید نے میری طرف دیکھا۔ نوید تو مجھے دیکھ کر ہنسنے لگی ــــ جانے کیوں ــــ مینا نے مجھ سے پوچھا:-

"آپ کچھ پریشان سے نظر آ رہے ہیں۔"

نہیں تو ..... میں نے اپنی نکٹائی درست کرنا شروع کر دی۔ جیسے ساری پریشانی اس نکٹائی کی وجہ سے ہو۔

دوبارہ فلم شروع ہو چکا تھا۔ اب مینا بھی فلم نہیں دیکھ رہی تھی۔ اگر دیکھ رہی تھی تو بس برائے نام۔ اس نے مجھے سمجھانے کی کوشش کے انداز میں کہا:-

"آپ فلم کیوں نہیں دیکھ رہے۔"

"تمہیں جو دیکھ رہا ہوں"

"آپ کو کیا ہو گیا ہے"

"فلم میں تم سے زیادہ کشش تو نہیں"

"تو پھر آئے کیوں تھے؟"

"تمہاری رفاقت کے لیے"

"خدا کے لیے آہستہ بولیے نوید سن لے گی"

مجھے اچانک بکنگ کلرک کی بات یاد آئی۔ میں نے سرگوشی کو اور آہستہ کرتے ہوئے اسے بتایا کہ بکنگ کلرک نے تمہارے متعلق یہ بات کی تھی۔ وہ کچھ پریشان سی ہو گئی۔ میں نے بھی سوچا کہ بکنگ کلرک کو کیا حق پہنچتا تھا کہ وہ اس طرح کھلے الفاظ میں بینا کے متعلق مجھ سے پوچھتا۔ بے حیا کہیں کا۔ مجھے اس پر غصہ آ رہا تھا۔ مگر اب تو وقت گزر چکا تھا۔ بینا ابھی تک کچھ کچھ پریشان تھی۔ اگرچہ وہ اپنی پریشانی کو چھپانے کی کوشش کرتی رہی۔ میں نے اسے چھیڑنے کے انداز میں کچھ کہنا چاہا تو اس نے میرا نام لے کر کہا۔

"ہمیں پکچر ختم ہونے سے پہلے ہی باہر نکل جانا چاہیے۔"

"اچھا"

اس نے میرا نام پہلی مرتبہ لیا تھا۔ اگرچہ اس انداز میں احترام بھی تھا۔ اس کے لہجہ میں ایک خوف سا بھی تھا جسے میں نہ سمجھ سکا ــــ جانے یہ کس چیز کا خوف تھا۔ ہم فلم ختم ہونے سے پہلے ہی باہر نکل آئے۔ باہر نچلے درجے کی لمبی لائن لگ چکی تھی۔ دو تین تانگے چلتے چلتے ہمیں دیکھ کر سڑک پر رک گئے۔ میں نے کہا۔

"آؤ چلیں ہم دونوں کا اکٹھا ایک فوٹو ہو جائے۔"

"یہ کوئی وقت ہے"

"بڑا اچھا وقت ہے۔ دو منٹ لگیں گے۔ وہاں سے سیدھے گھر چلی جانا۔"

"کچھ تو سوچیے نوید ساتھ ہے وہ کیا کہے گی۔"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اتنے میں نوید بالکل قریب آ چکی تھی۔ وہ دونوں

"تانگے کی پچھلی سیٹ..... پر بیٹھ گئیں۔ میں اگلی سیٹ پر جا بیٹھا۔ اس نے گھبرا کر کہا۔

"یہ کیا؟"

"کیوں"

"آپ دوسرے تانگے میں بیٹھیں"

کوچوان ابھی گھوڑے کی باگ پکڑے سڑک پر کھڑا تھا۔ میں نے اسے پھر فوٹو کے لیے کہا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ مجھے یہ ذرا اٹرا لگا۔ میں اس تانگے سے اتر کر دوسرے تانگے پر چڑھنے سے پہلے اس کے قریب کھڑا ہو گیا۔

"میں چلا جاؤں"

"آپ کیا کر رہے ہیں۔ لوگ کیا کہیں گے"

میں نے سینما کی طرف جھانکا اقطار میں کھڑے بہت سے لوگ ہماری ہی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں دوسرے تانگے میں جا بیٹھا۔ اس نے سوچا ہو گا اکٹھے بیٹھنے سے کوئی ہمیں دیکھ نہ لے حالانکہ تانگہ پر اس طرح چڑھنا پھر اترنا بہت سے لوگوں کو شک میں ڈال سکتا تھا۔ میں نے شک کی ایک جھلک چند لوگوں کی آنکھوں میں دیکھ بھی لی تھی۔ وہ بڑی توجہ سے ہماری طرف نظریں جمائے دیکھ رہے تھے۔ میں جلدی سے دوسرے تانگے پر سوار ہو گیا تھا۔ اُن کا تانگا آگے آگے اور میرا پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ میں نے پچھلی سیٹ پر ایک ٹانگ پھیلا دی اور دوسری کو لٹکے رہنے دیا۔ یہ انداز بے نیازی ظاہر کرنے کے لیے دانستہ اختیار کیا گیا تھا حالانکہ میں ذہنی طور پر سخت پریشان تھا۔ مینا نے میری

بات نہ مان کر دوری کی ایک خلیج حائل کر دی تھی۔

اس وقت مجھے کریم کلر سمر کی پینٹ کی کریز کا بالکل خیال نہیں آرہا تھا۔ میں اپنی مدت مدید کی اس عادت کو ایک ہی لمحہ میں بھول گیا تھا میری دو گھوڑا بوسکی کی قمیض کو شاید سیٹ کی پشت کی دھول چمٹ گئی تھی۔ مجھے رومال سے سیٹ صاف کرنا یاد ہی نہ رہا تھا۔ میرے ذہن کو غصہ کی آگ نے جلا دیا تھا۔ وہ نفاست طبع جو میرے حلقہ احباب میں انوکھی سی چیز تھی۔ میں سراسر بھول چکا تھا۔ اس وقت تو میرا ذہن کھول رہا تھا۔ ایک فرلانگ کے قریب دونوں تانگے آگے پیچھے چلتے رہے۔ بینا نے میری طرف دیکھا مگر میں سائیڈ میں نظریں جمائے بت بنا بیٹھا رہا۔

چوک پر دونوں تانگے اپنی اپنی سڑک پر ہو لیے۔ اور میں نے سوچا ہم دونوں کے راستے جدا ہیں۔ اسے تو مجھ پر اعتماد ہی نہیں یا اس کے اپنے دل میں کوئی چور ہوگا۔ اسی لیے تو اس نے اکٹھا فوٹو اتروانے سے گریز کیا ـــــ چند گز تک تانگے اپنی اپنی سڑک پر برابر برابر چلتے رہے۔ میں نے کنکھیوں سے دیکھا۔ بینا ٹکٹکی باندھے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ شاید وہ میرے احساس اور غصہ کو بھانپ گئی تھی۔ میں اس کی پروا کیے بغیر بے نیازی سے سڑک کی سیدھ کی طرف دیکھتا رہا۔ آخر اس کا تانگہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

O

بینا کی یہ ضد مجھے بُری تو لگی تھی اور اس وقت میں نے اجتناب کا جو انداز

اختیار کیا تھا اس میں زیادہ دخل بناوٹ کو بھی تھا۔ غصّہ اور بناوٹ نے مل کر ایک اچھا خاصا تاثر چھوڑا تھا اور یہ تاثّر ہمارے درمیان ایک اچھی خاصی خلیج حائل کر رہا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا میں کبیدہ خاطر ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ مجھے اس پر بیحد غصّہ آنے لگا۔ ایسا غصہ جسے میں ضبط کرنا چاہتے کے باوجود ضبط نہ کر سکتا تھا۔ وہ اس وقت میرے قریب نہ تھی ورنہ جو میرے جی میں آتا کہتا چلا جاتا۔ باتوں کے گھاؤ بڑے گہرے ہوتے ہیں۔ غصّہ میں کہی ہوئی باتیں تو اور بھی تکلیف دہ ہوتی ہیں۔

کافی دن اسی طرح گزر گئے۔ ہم دونوں نہ تو ایک دوسرے سے ملے، نہ ہی کسی کی طرف سے کوئی پیغام آیا۔ اس کا خط تک نہ آیا تھا۔ میرے غصّہ نے اور بھی شدّت اختیار کر لی۔ میرے دل کو یہ بات بھی نہایت بُری لگی۔ وہ مجھ سے محبت بھی کرتی تھی اور پھر بنتی بھی تھی یا شاید محبت نہیں کرتی تھی صرف بنتی تھی۔ میں نے سوچا میں اس سے کبھی بات نہیں کروں گا۔ آخر وہ اتراتی کس بات پر ہے۔ "کیا کائنات کی حسین ترین چیز وہی ایک رہ گئی ہے؟" کتنی بُری ہے وہ، اسے احساس تک نہیں کہ میں نے کسی کو ناراض کیا تھا۔ میں غصّہ کے شعلوں میں جلتا رہا۔ میرے پاس اس کے صرف چند خطوط پڑے تھے جن کو میں اتنی بار پڑھ چکا تھا کہ ان کی عبارت مجھے ازبر ہو گئی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے میں ان خطوط کو اپنی زندگی کا سرمایہ سمجھتا تھا۔ میرے لیے وہ دنیا کی سب سے زیادہ قیمتی چیز تھی۔ مگر اب تو میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ میں نے ان تمام خطوط کو نکالا اور بغیر دیکھے اور پڑھے ایک ایک کو پھاڑ پھاڑ کر آگ

پر رکھتا چلا گیا۔ ان سے جو شعلے نکلے وہ دیرپا نہ تھے۔ میں ان شعلوں کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا تھا۔ اب وہاں صرف راکھ کا ڈھیر تھا۔ ڈھیر جو میرے دل کی طرح جل کر سیاہ ہو چکا تھا۔ میرے دل میں بے پناہ بے چینی تھی اور چہرے پر کرب کے آثار بے حد نمایاں تھے۔ خطوط کی راکھ تیز ہوا سے یوں اڑنے لگی جیسے میری محبت کا جنازہ جا رہا ہو —— یوں دل کو قدرے سکون بھی ملا کہ چلو چھٹی ہوئی۔ روز روز کی سردرد ختم ہوئی۔ محبت ہے ہی دائمی کھکل۔ مگر بے چینی سی اب بھی تھی۔

میرے سامنے ماضی کی کچھ تصویریں گھومنے لگیں۔ مجھے اس کی جو جو بات یاد آ رہی تھی وہ چرکے لگا رہی تھی۔ اس کا ہر بات میں الٹا چلنا۔ اس کا بیجا غرور جو شاید مجھے پہلے کبھی محسوس بھی نہ ہوا تھا۔ اب دل کو چبھ رہا تھا۔ مجھے اس کی محبت میں کبھی کبھی جو شک گزر رہا تھا اب یقین کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ پھر یہ فیصلے معلوم نہیں جذباتی تھے یا غیر جذباتی۔ محبت کے متعلق میرا نظریہ یہ تھا کہ یہ اندھی ہوتی ہے طوفان کی طرح آتی ہے اور زندگی کی ہر چیز پر چھا جاتی ہے جو لوگ اس کے کسی پہلو پر غور کرتے ہیں وہ سچی محبت نہیں کرتے۔ ان کی محبت قابل اعتبار نہیں ہوتی۔ وہ کھوٹا اور کھرا پہچانتے ہیں۔ سود و زیاں دیکھتے ہیں اور یہ کام عقل کے ہیں دل کے نہیں۔ عقل خود غرض ہے اور دل ایک اندھا جذبہ جو آدمی عقل کی متعین کی ہوئی راہوں پر چلتا ہے وہ قطعی محبت کے قابل نہیں ہے۔ محبت تو ایک ایسا سچا جذبہ ہے جس کے سامنے ہر چیز ہیچ ہے۔ محبت میں سنبھل سنبھل کر قدم رکھنے والا محبت کرنے والا نہیں بلکہ بیوپاری ہے۔

بیناؔ کے متعلق میں جیسے جیسے غور کرتا رہا مجھے یوں لگا جیسے وہ میرے ساتھ بیوپار کرتی رہی ہے۔ اور وہ بیوپاری بھی کوئی تجربہ کار بیوپاری ہے۔ ورنہ وہ محبت کی روشوں پر اتنا سنبھل سنبھل کر قدم نہ رکھتی۔ انسان اپنی پہلی محبت میں اتنا اندھا ہوتا ہے کہ وہ محبت کے اندھے جذبے کے سوا کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتا۔ اور یہ کیفیت میناؔ میں قطعی نہیں تھی۔ وہ تو ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھاتی تھی۔ فوٹو بھی کوئی چیز تھی۔ ذراسی بات تھی۔ پھر وہ اس سے ڈرتی کیوں تھی۔ محبت کرنے والے لوگ تو رسوائیوں کو سینے سے چمٹا لیتے ہیں۔ یہ تو اتنی بڑی بات بھی نہ تھی۔ اس کے دل کی تہہ میں ضرور کوئی کانٹا ہوگا جسے وہ ظاہر نہ کرنا چاہتی ہوگی۔ شاید اس نے یہ سوچا ہو کہ میں اسے چھوڑ جاؤں گا۔ یا اسے مجھ پر اعتماد نہ ہو اور وہ اسے اپنی رسوائی کے ڈر سے مجھے نہ دینا چاہتی ہو۔ یا کوئی اور اس قسم کی وجہ ہوگی۔ کوئی بھی وجہ ہو۔ آخر وہ اس طرح سوچتی کیوں تھی۔ وہ یقیناً اپنی پہلی محبت میں شکست کھا چکی ہوگی۔ ورنہ اس کی محبت میں ایک دیوانگی ہوتی اور دیوانگی کسی کو کچھ بھی تو نہیں سوچنے دیتی۔

میری یہ اضطراری کیفیت دن بدن کم ہوتی رہی۔ وقت سرپٹ بھاگتا گیا۔ زندگی ایک خلا کے باوجود قدرے پرسکون نظر آنے لگی۔ میں بیناؔ کو تقریباً بھول گیا پھر بھی کبھی کبھی اس کی یاد ستانے لگتی۔ میں مکمل طور پر اس کی یاد سے نجات حاصل کرنے کی کوشش میں تھا۔ کہ لائبریری میں اس کی نرم و شیریں آواز آئی۔ میں چونکا۔ وہ یہاں کیسے آسکتی تھی۔ میں تو یہی سمجھتا رہا تھا کہ اتنے عرصہ میں وہ مجھے بھول بھی چکی ہوگی۔ شاید کوئی اور لڑکی ہو۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا۔ میں نے

کرٹن کے اندر جھانکا ۔ وہ کرٹن کے پیچھے بیٹھی تھی ۔ اس نے لائبریری کلرک سے پوچھا ۔ " بیگ کس وقت تک مل سکیں گے ؟" کلرک نے کہا ۔ " دن میں دو چار مرتبہ آتے ہی ہیں ویسے ان کا کوئی خاص وقت نہیں ہے ۔ آپ کا کوئی خاص پیغام ہو تو پہنچا دونگا ۔"

بیناؔ نے کہا ۔ " میں نے تو صرف ہاتھ دکھانا تھا ۔" کلرک ہنسنے لگا " ہاتھ ؟ آپ کے ہاتھ میں کیا خرابی ہے ۔ آپ تو بڑی خوش قسمت ہیں ۔" اس کے آگے وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا ۔ بیناؔ نے ایک ٹھنڈی لمبی آہ بھری اور چپ ہو گئی اس کی آہ میں جو اذیت ناک کیفیت تھی وہ میں نے بھی محسوس کر لی تھی ۔ مگر مجھے ترس آنے کی بجائے الٹا اس پر غصہ آ رہا تھا ۔ شاید اس کی ایک وجہ اس کا بیگ کو اسی طرح سے لفٹ دینا ہو میرے دل کا اضطراب بڑھتا جاتا تھا میں وہاں سے اٹھ کر برآمدے میں ٹہلنے لگا ۔

چند ہی لمحوں بعد وہ میرے سامنے کھڑی تھی اس کا چہرہ لٹکا ہوا تھا ۔ اس نے ایک نظر مجھے دیکھا شاید میرے موڈ کا اندازہ لگانا چاہتی تھی ۔ پھر اس نے نظریں جھکا لیں اور بڑی کوشش سے چند الفاظ ادا کیے ۔

" آپ کی امانت میرے پاس ہے ۔ آپ لے لیں "

میں نے چپکے سے ہاتھ آگے بڑھا دیا ۔ سخت غصہ کی وجہ سے میں جواباً ایک لفظ بھی ادا نہ کر سکا ۔ اس نے اسی سنجیدگی سے کہا ۔

" اس وقت میرے پاس نہیں ہے آ کر لے جائیں "

" اچھا " میں نے جیسے بم پھینک دیا ہو ۔ اور وہ خوفزدہ سی آگے بڑھ گئی ۔

میری بے چینی انتہا کو پہنچ رہی تھی۔ چند گھنٹے میں نے اسی طرح گزارے۔ مختلف قسم کے خیالات آپس میں بُری طرح گڈ مڈ ہوتے رہے۔ مجھے اس پر سخت غصّہ آ رہا تھا۔ میں اس سے فوراً قطع تعلق کر لینا چاہتا تھا۔ مجھے اس کے اس رویے پر بھی کُڑھنا پڑ رہا تھا۔ کم از کم انکسارانہ کیفیت ہوتی۔ چلو معافی نہ سہی۔ معافی کا سا انداز ہی ہوتا۔ لیکن وہ تو یوں بات کرتی رہی جیسے میں کوئی اجنبی تھا۔ شاید یہ سب محض میرا احساس ہو۔ اور اس احساس کی بنیاد وہ غصّہ ہو جو شعلوں کی طرح بھڑک رہا تھا۔

اگر وہ کچھ عرصہ اور میری نظروں سے اوجھل رہتی تو میں اسے یکسر بھول چکا ہوتا۔ اس نے میرے زخموں پر پھر سے نمک چھڑک دیا تھا۔ جانے وہ مجھے کیا دینا چاہتی تھی۔ یہ جاننے کے لیے میرا اضطراب بڑھا۔

جب میں اس کے پاس پہنچا وہ مایوس اور مغموم تنہا بیٹھی تھی۔ ماحول خاموش اور اداس تھا۔ اس نے مری ہوئی آواز میں مجھے بیٹھنے کو کہا مگر میں کھڑا ہی رہا۔ میرے منہ سے بھی کوئی بات نہ نکل رہی تھی اور وہ بھی خاموش تھی۔ چند منٹ یونہی گزر گئے۔ پتہ نہیں کیوں مجھے اپنی طبیعت میں اتار چڑھاؤ سا محسوس ہوا۔ اس کی وجہ میں خود بھی نہ جان سکا۔ شاید مبہم سا احساس اس کی ویرانی دیکھ کر پیدا ہو گیا ہو۔ یا اس کے حسن نے میرے دل پر غلبہ پا لیا ہو۔ میرے غصّہ میں اب بھی ذرا بھی فرق نہیں تھا۔ لیکن دل کے کسی نہاں خانے میں اس کے لیے کچھ نہ کچھ ہمدردی ضرور پیدا ہو چکی تھی۔ اس نے روتی سی صورت بنا کر مجھے کہا:۔

"آپ بیٹھیں گے نہیں۔"

"نہیں" میرا جواب مختصر اور سخت تلخ تھا۔

دوسرا جملہ اور بھی کڑوا تھا

"تم نے مجھے کیوں بلایا تھا"

"یہ آپ کی امانت میرے پاس تھی"

اس نے اپنے پرس سے چند خطوط نکالے اور کانپتے ہاتھ سے مجھے پکڑا دیئے۔ پھر وہ الماری کی طرف مڑی۔ وہاں گتّے کے ایک ڈبے میں کوئی شکل سی بنی ہوئی تھی۔ یہ غالباً کوئی جاپانی چیز تھی۔ جب اس نے ڈبے کو الٹا کیا تو بہت سے ٹکڑے نیچے آگرے۔ انہی کو خاص ترتیب سے جوڑنا تصویر پیدا کرتا تھا۔ ان ٹکڑوں کی تہہ کے نیچے ایک رقعہ تھا۔ وہ رقعہ اس نے مجھے دیتے ہوئے کہا۔ "یہ بھی آپ کا ہے" یہ رقعہ میں نے فوراً پہچان لیا۔ یہ بڑے موڈ میں لکھا گیا تھا اور ہماری محبت کی بڑی اہم دستاویز تھی۔ میں رقعہ پکڑنے لگا تو میری نظریں بے وجہ اس کی طرف اٹھ گئیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ مگر میں غصہ کی وجہ سے ان آنسوؤں کے متعلق کچھ بھی نہ سوچ سکا۔

میں نے پوچھا:۔

"بس یا کچھ اور"

میں نے پہلا قدم اٹھا لیا تھا مگر نظریں اس کی طرف تھیں۔ اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"ذرا ٹھہریئے!!"

میں رُک گیا اور تیز تیز نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

وہ کچھ کہنے کے لیے اپنی تمام طاقتیں مجتمع کر رہی تھی مگر اس کے لب ابھی تک سِلے ہوئے تھے۔ مجھے پتہ نہیں کیوں یہ محسوس ہونے لگا کہ وہ سچ مچ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ پھر مجھے یہ سوچ کر اور بھی غصّہ آیا کہ جب وہ مجھ سے اس قدر محبت کرتی ہے تو پھر اس کا اظہار کیوں نہیں کرتی۔ اپنی محبّت کو چھپائے چھپائے کیوں پھرتی ہے۔ وہ اس میں اپنے وقار پر ضرب کیوں سمجھتی ہے۔ میں تو اظہارِ محبت کرتے وقت اپنے اس جذبے کو چھپانے کی کوشش نہیں کرتا۔ میرے لیے یہاں کھڑے کھڑے یہ نئی الجھن پیدا ہو گئی تھی۔ میں نے سوچا شاید یہی عورت کی فطرت ہو۔ شاید یہی عورت کا حسن ہو۔ میں ابھی اپنی الجھن سے نجات حاصل کرنے نہ پایا تھا کہ اس نے کہا:۔

"مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے"

"ہاں کہو"

"آپ ذرا بیٹھ جائیں"

مجھے پتہ بھی نہ لگا کہ میں کیسے بیٹھ گیا۔ شاید میں اس کی باتیں توجہ سے سننا چاہتا تھا۔ اب اچانک اس کی قوّت گویائی لوٹ آئی۔ شاید میری سوچ کے دوران اس نے اپنی سوئی ہوئی قوتوں کو مجتمع کر لیا تھا۔ اس نے زخمی سی آواز میں کہا۔

"آپ مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جا رہے ہیں؟"

"ہاں" میں نے غصہ میں جواب دیا لیکن مجھے ایسا محسوس ہُوا جیسے

یہ غصہ کھو کھلا ہو رہا ہے۔

اس کے لب تھرا رہے تھے۔ اس کی آواز میں ارتعاش تھا۔ اس نے غمگین صورت اور آنسو بھری آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ "جب آپ نے مجھے اتنی دُور لے جا کر اکیلی کو تن تنہا چھوڑ دینا تھا تو پھر سہارا کیوں دیا تھا۔" اور اس کے بعد وہ زار و قطار رونے لگی۔ اور میں بُت بنا دیکھتا رہا۔ جب وہ جی بھر کر رو چکی اور اس کے آنسوؤں کا طوفان قدرے تھم چکا تو اکا دُکا آنسو گرنے لگے۔ پھر آنسو دبے دبے آتے اور چپکے سے اس کے رخساروں پر پھیل جاتے۔ یہ سب اس کے رومال میں جذب ہو رہے تھے اور رومال بالکل بھیگ چکا تھا۔ کافی دیر یہ کیفیت رہی پھر اس کے آنسو ایکدم رُک گئے۔ اس نے ایک لمبی ٹھنڈی آہ بھری اور میری طرف دیکھا۔ اس کی ہلکی سرخ آنکھوں نے اس کی صورت مسخ کر دی تھی۔ بات کرنے سے پہلے اس کے چہرے پر کرب کے آثار پیدا ہوئے۔ اس نے بڑے دُکھ سے مجھے کہا:-

"جانے سے پہلے مجھے زہر دیتے جایئے۔ اب میں اور زندہ رہنا نہیں چاہتی"۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا

"کس کے لیے زندہ رہوں گی" وہ پھر رونے لگی۔

"جس کے لیے پہلے رہتی تھیں۔"

"وہی تو میرا نہیں رہا۔"

مگر مجھے اس پر ترس ہی نہیں آ رہا تھا۔ الٹا نفرت تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ میں نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ "بس؟ یا کچھ اور بھی کہو گی۔" میں

نے اسی غصّہ سے کہا۔ اور اُٹھ کر چلنے لگا۔

"ٹھہریئے" ایک دم غصّہ کا ایک پُرزور طوفان آیا۔ اس نے مجھے نہایت غصّہ سے دیکھتے اور چلاتے ہوئے کہا۔

"کسی کی زندگی یوں برباد کر کے آپ کہاں جا سکتے ہیں۔ آپ سمجھتے ہیں آپ خوش رہ سکیں گے۔ میں آپ کو بھی برباد کر کے چھوڑوں گی۔"

مجھے ہنسی آ گئی مگر میری ہنسی میں زہر تھا۔ میں نے تلخ انداز میں اسے کہا۔

"پاگل میں تو پہلے ہی برباد ہوں تو مجھے اور کیا برباد کرے گی۔"

اس کے غصّہ میں ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ کہنے لگی۔

"میں آپ کو شادی نہیں کرنے دوں گی۔"

مجھے ہنسی آ گئی

"تمہیں کس نے کہا ہے میں شادی کروں گا۔ میں کبھی بھی شادی نہیں کرونگا۔ بے فکر رہو۔ اور کہو؟"

وہ بالکل چپ ہو گئی۔ اس کا غصّہ بالکل ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ اس نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔

"آپ جا ہی رہے ہیں تو میرا گناہ تو بتاتے جایئے۔"

"مجھے نہیں پتہ" میں نے قدرے نفرت سے کہا۔

"میں پوچھے بغیر نہیں جانے دوں گی۔ بتایئے؟"

"کیا بتاؤں؟"

"میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے؟"

"میں نے کہہ جو دیا مجھے کچھ نہیں پتہ ۔"

اس نے اپنے دونوں کان پکڑ لیے ۔

"معافی"

مجھے ہنسی آگئی

"کس بات کی ؟

"ناک سے لکیریں بھی نکال دوں"

وہ ذرا سا جھکی تو میں نے اس کو پکڑ لیا ۔ پتہ نہیں میرا دل کیوں بلیوں اچھل رہا تھا ۔ اگرچہ میں نے اس وقت اس بات کا اظہار نہ کیا ۔ اس نے مجھے پھر پوچھا ۔

"معافی"

"ہاں

"صلح"

"ہاں

وہ مسکرا دی ۔ میں خوش ہو گیا ۔ میں اسے سمجھانے لگا :۔

"بینا کاش تم مجھے سمجھ سکو ۔ مجھے تمہاری قسم میں نے تمہیں اتنا چاہا ہے کہ اگر خدا کو بھی اتنا چاہتا تو وہ بھی میرا بن جاتا ۔ تم میری ہو کر بھی میری نہیں ہو ۔ تم کیا جانو میں تم سے کتنا پیار کرتا ہوں ۔ تم ضد کرتی ہو اور کبھی نہیں سوچتیں کہ تمہارے کسی انکار پر میرے دل پر کیا بیتتی ہو گی ۔ تم کیسی ڈاکٹر ہو جو نہ مرض کو سمجھ پاتی ہو اور نہ مریض کو ۔"

وہ پھر مسکرانے لگی۔ ہم دیر تک باتیں کرتے رہے پھر میں نے کہا" اجازت"۔
اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ میں پھر بیٹھ گیا۔ اس نے چائے منگوائی اور ہم چسکیاں لے لے کر پیتے رہے۔

○

میں نے بے وجہ ہی اسے اتنا رلایا۔

بات تو کچھ بھی نہیں تھی یونہی ملال پیدا ہوتا رہا۔ تجربہ سے ثابت ہوا انسان جن خیالات میں گھر جائے اسی قسم کے احساسات اس میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ زندگی میں انسان کتنی ہی دفعہ اس قدر مایوس ہو جاتا ہے کہ اسے زندگی بوجھ نظر آنے لگتی ہے۔ وہ بیزار بیزار سا اس بوجھ کو اپنے کندھوں سے پھینک دینا چاہتا ہے۔ کبھی اس کی امیدیں اتنا چمک اٹھتی ہیں کہ یہی زندگی کلیوں سے زیادہ حسین محسوس ہونے لگتی ہے حالانکہ وہی حالات ہوتے ہیں وہی ماحول ہوتا ہے وہی مسائل ہوتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سب اپنے ہی احساسات ہوتے ہیں۔ جدھر ان کی رو ہو وہی کیفیت طاری ہو جاتی ہے شاید یہی بات میرے ساتھ ہوئی تھی۔ بہرحال اب میں رہی سہی اس کدورت کو دور کر دینا چاہتا تھا۔ جو ان عجیب و غریب حالات کے تحت بے وجہ پیدا ہو گئی تھی۔

اب کی غیر متوقع طور پر میں اس کے پاس پہنچا وہ کچھ حیران بھی ہوئی لیکن وہ بہت خوش تھی۔ شاید اس وقت اس کے جی میں یہی خواہش ولولے لے رہی تھی کہ میں اچانک کہیں سے، جلدی سے آ جاؤں۔ مجھے دیکھ کر مسرت کی ایک

لہر اس کے چہرے پر دوڑ گئی۔ وہ بہت ہی خوبصورت لگ رہی تھی۔ یوں جیسے کوئی ملکوتی حسن۔ اس نے کھلے گلے کا کھلا سا رنگین فراک پہن رکھا تھا۔ جو اس کے ٹخنوں سے ذرا ہی اونچا ہو گا۔ اس کا سر بالکل ننگا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر اپنے جسم کے کسی حصے کو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ شاید اب وہ مجھے اتنا غیر نہیں سمجھتی تھی۔ مجھے اس پر پیار آگیا۔ میں اس کی طرف بڑھا مگر پھر کچھ سوچ کر رک گیا۔ شاید اس نے میری اس حرکت کا اندازہ لگا لیا تھا۔

اس نے آج پھر شادی کا ذکر چھیڑ دیا۔ یہ میری کمزور رگ تھی اور میں ہمیشہ اس قلعے کو توڑنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اور اسی بات سے اس کو چڑ تھی۔ کبھی کبھی تو شاید اسے محض اسی وجہ سے شک گزرتا تھا کہ میں اس سے بے وفائی کروں گا۔ یہ میری کمزوری تھی کہ میں اسے اس کی اصل وجہ کبھی سمجھا ہی نہ سکا تھا۔

آج اس نے مجھے بہت ہی مجبور کیا تو مجھے کہنا ہی پڑا، "میں سوچ لوں۔" اس نے مجھے سوچنے کی اجازت دے دی۔ اگرچہ وہ ایک لمحہ کے لیے غمگین سی ہو گئی تھی۔ وہ تو مجھ سے یہ توقع رکھتی تھی کہ میں فوراً ہاں میں ہاں ملا دوں گا مگر میرے سامنے حدِ نظر تک مسائل پھیلے ہوئے تھے۔ زندگی الجھنوں ہی کا تو نام ہے۔ سب سے پہلے تو یہی الجھن کافی تھی کہ میں نے اپنے آپ سے کبھی شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ اب مجھے اپنا یہ اصول توڑنے میں قدرے تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ چند اور رکاوٹیں بھی کچھ کم اہم نہ تھیں۔ میں ان رکاوٹوں کے بارے میں سوچتا رہا اور وہ میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھتی

رہی۔ میں نے اسے اس قدر اپنی طرف متوجہ پایا تو بے وجہ مسکرانے لگا۔ وہ بھی شاید مجھ سے بالکل مایوس نہ تھی۔ اس نے مجھے پوچھا آپ کب بتائیں گے۔ میں نے کہا اب کی جب آیا تو اپنا فیصلہ تمہیں بتا دوں گا...... اس کے بعد مجھے وہاں بیٹھنا کچھ بوجھ سا محسوس ہو رہا تھا اس لیے میں وہاں سے چلا آیا۔

○

میں نے محسوس کیا کہ مجھے سچ مچ مینا سے محبت ہو چکی ہے۔ اگرچہ میں ابھی تک شادی کے خلاف تھا پھر بھی میں نے سوچا اس میں حرج بھی کیا ہے آخر ایک دن تو پھنسنا ہی ہے۔ زندگی میں جب اس فرض سے نجات نہیں تو مینا سے بہتر اور کون لڑکی ہو سکتی ہے۔ سوچ کے اسی سمندر میں ایک خیال اور ابھرا۔ یہ میں کئی مرتبہ سن چکا تھا کہ لو میرج عام طور پر ناکام رہتی ہے۔ میرے دل میں خطرہ پیدا ہو چلا کہیں اس کا انجام بھی ویسا ہی نہ ہو جیسا عام طور پر کہا جاتا ہے۔ زندگی میں پہلے ہی کونسا سکون ہے جو رہی سہی بات بھی جاتی رہے۔ اور ان سب باتوں کے علاوہ میرے پاس اتنا روپیہ نہیں تھا کہ شادی کے بھاری اخراجات کے لیے صرف کر سکتا۔ یہ سوچ کر میں پریشان سا ہو گیا۔

میرا دل نہیں لگ رہا تھا۔ کچھ مینا کی یاد بھی ستا رہی تھی۔ اگرچہ اسے ملے ہوئے کچھ زیادہ وقت نہ گزرا تھا پھر بھی میرا ملنے کو جی چاہتا تھا اور بغیر سوچے میرے قدم اس کی طرف بڑھ گئے۔ وہ آج سیدھے سادے لباس میں تھی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا وہ مجھے غیر سی لگی۔ میں اسے نظر فریب سمجھ کر بھول جانے

پتہ تل گیا۔ اس کی سوالیہ نظریں میرے چہرے پر ٹکی رہیں۔ اس نے مجھ سے کسی قسم کی کوئی اور بات نہ کی۔ ابھی میں پوری طرح بیٹھا بھی نہ تھا کہ اس نے پہلا سوال کیا:۔

"آپ نے کچھ سوچا؟"

"ہاں"

"کیا؟"

"مجھے ایک دفعہ اور سوچ لینے دو"

"سوچ لیجئے" اس کے لہجہ میں کچھ گھبراہٹ اور کچھ فکر تھی۔

"ابھی نہیں۔ چند دن اور ٹھہرو"

"آپ کب تک انتظار کروائیں گے"

"اتنی جلدی کیا ہے"

"آپ میری مجبوریوں کو نہیں سمجھ سکتے" اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔۔۔ لیکن میں اپنی مجبوریوں کو سمجھتا تھا اور پھر یہ بھی تھا کہ جلد بازی کا کوئی فیصلہ زندگی کو کسی بڑے خطرے میں بھی ڈال سکتا تھا۔ میں کوئی دانشور تو نہیں تھا مگر زندگی کے نشیب و فراز سمجھتا تھا اور اسی لیے پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا۔

تنہائی میرا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھی۔ میں تو پریشانی سے بچنے کے لیے اس کے پاس آیا تھا لیکن اس نے پھر وہی مسئلہ چھیڑ دیا تھا۔ میری الجھن میں الٹا اور اضافہ ہو گیا۔ وہ بھی چپ چاپ سی تھی۔ میں بھی کچھ پریشان سا تھا۔ ماحول پر اداسی سی چھائی رہی۔ میں جلد ہی اٹھ کر چلا آیا۔

○

غیر محسوس طور پر مجھ میں جو تبدیلی پیدا ہوئی تھی اس میں یقیناً مینا کا ہاتھ تھا۔ جو سرد جنگ کتنی ہی دیر سے دل اور ذہن میں ہوتی رہی تھی اس کا آخر فیصلہ ہو ہی گیا۔ اور میں اس فیصلے سے کچھ غیر مطمئن بھی نہیں تھا۔

خوشی کی ایک لہر تھی جو میرے دل کو اچھال رہی تھی۔ میں نے بڑے موڈ میں شیو بنائی نیا سِلا ہوا سوٹ پہنا۔ نئی جرابیں پہنیں۔ نکٹائیوں میں سے بہترین نکٹائی کا انتخاب کیا۔ بڑی نفیس سی ناٹ لگائی۔ دو تین مرتبہ آئینہ دیکھا اور خوشی کے نشہ میں جھومتا، مینا کے پاس جا پہنچا۔

میں دبے پاؤں اوپر آیا تھا۔ مجھے دروازے کے قریب پہنچ کر بھینی بھینی سی خوشبو آئی۔ اس نے میری مسرت میں کچھ اور اضافہ کر دیا۔ دروازے کا ایک پٹ بند اور دوسرا کھلا تھا۔ میں نے اندر جھانکا تو نوید ہاتھ میں کوئی کتاب لیے کھڑی تھی۔ مینا بیٹھی اسے کچھ سمجھا رہی تھی۔ میں نے سننے کی کوشش کی مگر میرے پلے کچھ بھی نہ پڑا۔ میں نے پھر اندر جھانکا۔ مینا بڑی ہی پُر کشش نظر آ رہی تھی۔ اس کا حسن نکھرا نکھرا سا تھا۔ وہ سفید براق لباس میں تتلی کی طرح پر پھیلائے بیٹھی تھی۔ اس کا دوپٹہ اس کے بالوں میں اٹکا ہوا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے میں کچھ بھی اندازہ نہ لگا سکا۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا تو میں اندر داخل ہو گیا۔ نوید ہلکی سی گھبراہٹ میں اپنا دوپٹہ درست کرنے لگی۔ مینا تعظیم کے لیے اٹھی۔ میں میز پر بیٹھ گیا۔

"لیکچر فرمایا جا رہا تھا؟"

نوید کچھ جھکی مگر مینا اسی طرح سے بیٹھی رہی۔ میں نے پھر مینا کو چھیڑا۔

"ذرا ہمیں بھی تو مستفید ہونے کا موقعہ دیں"

وہ بس مسکرا کر رہ گئی۔ نوید ہنستے ہنستے اندر بھاگ گئی۔

مینا کے چہرے پر نکھار اپنے شباب پر تھا۔ آج اس کے لباس میں بھی خاص اہتمام تھا۔ اگرچہ بظاہر سادگی نظر آ رہی تھی مگر وہ ان چمکتے دمکتے ریشمی ملبوسات میں ماہتاب کی طرح جگمگا رہی تھی۔ میں جیسے جیسے اس کو قربت کی نگاہ سے دیکھتا اس کے حسن کی کشش میں اضافہ ہوتا جاتا۔ پتہ نہیں کیسے اور کیوں اچانک یہ طلسم ٹوٹ گیا۔ میرے اندر ایک ناگوار سا احساس پیدا ہوا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ دونوں کہیں جا رہی تھیں اور مجھے دیکھ کر انہوں نے یہ پوزیشن اختیار کر لی ہے۔ مجھے یہ سب ڈھونگ سا محسوس ہوا۔ اور مجھے اس بات کا دکھ بھی ہوا۔ لمحہ بہ لمحہ یہ خیال میرے ذہن میں تقویت پکڑتا گیا۔ مجھے اپنے اس انوکھے خیال پر یقین سا ہو چلا تھا۔ ایک نفرت سی میرے دل میں پیدا ہوئی۔ میں نے سوچا ان کے اس بہروپ کی وجہ وہ احساس ہو سکتا ہے جسے وہ اب تک چھپائے چھپائے پھرتی رہی ہے۔ جسے میں نے بارہا محسوس تو کیا ہے مگر آج تک زبان پر نہیں لا سکا۔

مجھے اس طرح خاموش سا دیکھ کر وہ چہکنے لگی۔ اور اس چہک کے پردے میں میرا تکلیف دہ احساس وقتی طور پر دب بھی گیا۔ میں اس سے باتیں کرتا رہا ہم نے جلدی جلدی کئی موضوع بدلے اور مجھے پتہ بھی نہ چلا تھا کہ ہم کب محبت کے موضوع پر آ کر رک گئے تھے۔ مجھے اچانک کچھ کہتے کہتے احساس ہوا کہ میں اسے محبت کا مطلب سمجھا رہا ہوں۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"آپ نے کبھی محبت کی ہے؟"

میں ایک لمحہ کے لیے پریشان سا ہو گیا۔ پھر پھیکی مسکراہٹ لبوں تک آتے آتے رہ گئی۔ وہ سنجیدہ ہو گئی۔

"آپ مجھ سے چھپانا چاہتے ہیں؟"

"اس سے کیا فائدہ ہو گا"

"کوئی خاص نہیں"

"کیا میں یہی سوال تم سے کر سکتا ہوں۔ سچ سچ بتا سکو گی"

"شاید"

"بتا دو تو کیا حرج ہے"

"کوئی خاص حرج نہیں"

میں تمہیں یقین دلاتا ہوں میں تمہارے ساتھ اسی طرح محبت کرتا رہوں گا۔ میں تمہیں دھوکا نہیں دوں گا۔ مجھ پر اعتماد کرو۔ مجھ میں عام آدمیوں کی نسبت بہت سی باتیں ایسی ہیں جو کسی عام آدمی کے لیے یقیناً انوکھی ہوں گی یا جو شاید بہت کم لوگوں میں ہوں یا شاید کسی میں بھی نہ ہوں۔ میرا خیال ہے اب اور وضاحت کی ضرورت نہیں رہی ہو گی۔"

"ٹھیک ہے میرے خیال میں آپ کو متفکر ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"بس مجھے یہی ایک دکھ ہے تم میں اعتراف کی جرأت نہیں۔ مجھے ہمیشہ کسی نہ کسی الجھن میں الجھا دیتی ہو۔ تمہاری ذرا سی سچی بات سے میری پریشانی دور ہو سکتی تھی۔"

وہ ہنسنے لگی۔

"آپ تو یونہی پریشان ہیں ۔ کوئی بات تو ہو"

"کوئی بھی بات ہو میں پریشان نہیں ہوتا ۔ ہاں اس وقت پریشانی سے بچنا میرے لیے محال ہو جاتا ہے ۔ جب میں سمجھتا ہوں کہ دانستہ مجھ سے کچھ چھپایا جا رہا ہے کیا تم اپنی یہ عادت ترک نہیں کر سکتی ہو ۔"

وہ ہنسنے لگی ۔ جیسے جیسے میری سنجیدگی میں اضافہ ہوتا رہا اس کی ہنسی بڑھتی رہی ۔ اس کے پیٹ میں بل پڑنے لگے ۔ میں ٹکر ٹکر اسے دیکھتا رہا جب وہ خوب ہنس چکی اور اس کی آنکھوں میں ہنسی کے زور سے آئے ہوئے آنسو جھلکنے لگے تو اس نے اپنے چھوٹے سے ریشمی رومال میں ان کو جذب کر لیا ۔ اس نے ایک نظر مجھے دیکھا ۔ میں بے حد سنجیدہ تھا ۔ ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی

"آپ سچ مچ مجھ سے ناراض ہو گئے ۔"

میں خاموش رہا ۔ میرا بڑا سا منہ اسی طرح لٹکا رہا ۔ وہ بھی سنجیدہ ہو گئی ۔

"میں معافی چاہتی ہوں"

میں خاموش رہا ۔ اگرچہ میرا غصہ خود بخود اتر رہا تھا ۔ پھر بھی میں نے ظاہر یہی کیا کہ میں ناراض ہوں ۔

اس نے ملتجیانہ نگاہ ڈالی

"آپ میرے ساتھ نہیں بولیں گے"

میں نے نفی میں سر ہلا دیا

"معاف بھی نہیں کریں گے"

میں نے پھر نفی میں سر ہلا دیا

"کیا جرمانہ ادا کروں"

اب کی میں اپنی ہنسی کو ضبط نہ کر سکا

بس یہی ادائیں تو تمہاری لے بیٹھی ہیں۔

میں تو کیا ادائیں دکھاؤں گی آپ کے نخرے ہی کیا کم ہیں۔"

"واقعی؟" میں نے بظاہر حیران ہو کر پوچھا

"دل جو دے بیٹھی ہوں۔ اب جس طرح چاہے ستا لیجئے۔ اپنے بس میں جو نہیں کچھ"

میں پیار بھری نظروں سے ٹکٹکی لگائے اسے دیکھتا رہا۔ اس نے میری نظروں کے ساتھ نظریں ملائیں لیکن وہ شاید میری نظروں کی تاب نہ لا سکی۔ نظریں جھکا کر خاموش ہو گئی۔ میری نظروں کی یہ ٹکٹکی بدستور قائم رہی۔ وہ اتنی خوبصورت لگ رہی تھی کہ میں فرطِ مسرت سے کوئی بات نہ کہہ سکا۔ چند منٹ ہم دونوں خاموش رہے۔ اس نے دو ایک بار نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔ اس کی ان پیار بھری نظروں نے مجھ سے بہت کچھ کہہ دیا تھا۔ ہم نے کافی دیر تک آپس میں کوئی گفتگو نہ کی لیکن اس خاموشی میں جو پیغام آ اور جا رہے تھے وہ شاید الفاظ میں ادا نہ ہو سکتے۔

نوید آئی اور ہم دونوں کو اس طرح بیٹھے دیکھ کر دروازے ہی سے مڑ گئی۔ کچھ دیر بعد اس کی امی آئی اور اس نے دوسرے دروازے کے پردے کے پیچھے کھڑے بینا کو آواز دی۔ اس نے کہا۔ امی آپ جائیے میں

آجاؤں گی۔ اس کی امی نے محبت بھری فہمائش کی " کھانا بھی وقت پر نہیں کھاتی ہو۔" بلینا انہیں ٹالتی ہی رہی اور وہ پردے کے پیچھے سے ہی مڑ گئیں۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ میں مسکرا رہا تھا۔ کہنے لگی:۔

" امی مجھے منع کرتی ہیں"

" کس بات سے"

" آپ سے ملنے سے"

" تو نہ ملا کیجیے حضور"

" یہ دل کا معاملہ ہے۔ اپنے بس میں تو ہے نہیں۔"

" یہی بات ان کو بھی کہہ دینا تھی"

" ان کو پتہ ہے"

" پھر کیوں روکتی ہیں"

" وہ روکتی تو نہیں وہ تو کہتی ہیں " شادی ہو جانی چاہیے۔ ملنے کا یہ طریقہ ٹھیک نہیں ہے۔" آپ نے کیا سوچا ہے؟"

" ابھی تو کچھ نہیں"

" وہ روٹھ گئی

" پھر آپ نے وعدہ کیوں کیا تھا۔ ابھی سوچ کر بتایئے۔ ورنہ میں آپ سے کبھی بات نہ کروں گی۔"

" اور اگر دل نے مجبور کیا تو؟"

" میں دل کو سمجھا لوں گی"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ دل تمہارے بس میں ہے۔"

"ہاں"

"پھر تم محبت کیسے کر سکتی ہو؟"

"کیا مطلب؟"

"محبت کرنے والوں کا دل اپنے بس میں کب رہتا ہے!"

"یہ سب ناولوں کی باتیں ہیں"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارا واقعی دل پر کنٹرول ہے۔"

"بالکل بالکل"

"پھر تو مسئلہ ہی حل ہو گیا۔"

"کیسے؟"

"شادی اور محبت دو علیٰحدہ علیٰحدہ چیزیں ہیں۔"

"وہ کیونکر"

"یہ ضروری نہیں کہ کامیاب محبت کامیاب شادی بھی ہو۔"

"میری سمجھ میں آپ کا فلسفہ بالکل نہیں آیا"

"یہی تو مصیبت ہے کہ تم سمجھ دار نہیں ہو"

"میں آپ کی طرح سمجھ دار بننا بھی نہیں چاہتی"

"تو کیا چاہتی ہو"

"شادی"

"کیا سچ"؟

"آپ مذاق نہ کیجئے۔ بتایئے آپ نے اس بارے میں کیا سوچا ہے۔"

"بتا دوں"

"میری قسم جلدی بتایئے میں بہت بے چین ہوں۔ میرا تو رنگ اڑا جا رہا ہے۔ کیا کوئی اچھا سا فیصلہ ہے؟"

"خدا کرے اچھا سا ہی ہو۔ آپ کا کیا اعتبار۔ ٹھہریئے ابھی نہ بتایئے مجھے ذرا سنبھل لینے دیجیے۔"

"سنبھل گئیں"؟

"کوشش کر رہی ہوں لیکن یہ تو بتایئے کوئی اچھا فیصلہ سنائیں گے یا بُرا۔"

"شاید اچھا ہی ہو لیکن یہ کیا پتہ تم اچھا کسے سمجھتی ہو اور بُرا کیسے ہو سکتا ہے، جو تمہاری نظر میں بُرا ہو وہ میری نظر میں اچھا ہو۔ جی۔ کیا خیال ہے؟"

"خدا کے لیے مجھے اور نہ ستایئے، میں تو پہلے ہی بڑی پریشان ہوں"

"کیوں جھوٹ بولتی ہو، ابھی تو تم اتنی خوش خوش نظر آ رہی تھیں۔"

"اب آپ مجھ سے انتقام لے رہے ہیں۔ خدا کے لیے جلدی سے کہہ دیجیے۔"

"جلدی، اچھی نہیں ہوتی، جلدی میں اگر کوئی بُری بات نکل گئی؟"

"میری برداشت کا امتحان نہ لیجیے۔ بس اب آپ جلدی سے کہہ دیجیے میں اپنی قسمت پر شاکر رہوں گی۔"

"ٹھہرو۔ صرف چند لمحے، مجھے کچھ سوچنے دو"

میں سوچ میں ڈوب گیا۔ لیکن یہ سوچ میں ڈوب پریشان کن نہیں تھی مسرت

کی ایک لہر تھی جس نے مجھے اپنے ساتھ بہالیا تھا۔ میں نے سوچا اگر مینیا میرے ساتھ وفا کرتی رہے تو یہ میری انتہائی خوش نصیبی ہوگی۔ شادی کے معاملے میں مجھے جن الجھنوں کا اندیشہ ہے وہ سب مجھے قبل از وقت ہی مینو کو صاف صاف بتا دینا چاہئیں۔ وہ میری ہمسفر ہے وہ بھی تو میری طرح سوچے گی۔ شادی کے بعد بھی جو چیزیں چپقلش کی بنیاد بنتی ہیں میں ان کے متعلق بھی اسے آگاہ کر دینا چاہتا تھا۔ میں آنے والی ٹریجڈی سے بڑا خائف تھا۔ اور میں چاہتا تھا کہ ان باتوں کا تصفیہ ابھی سے ہو جانا چاہیئے۔ ان تمام احساسات کے پیش نظر میں نے اسے کہا

"میں نے جو کچھ سوچا ہے وہ شاید کچھ اچھا ہی ہے لیکن میں ڈر رہا ہوں۔"

"آپ کیوں ڈر رہے ہیں ؟"

اس لیے کہ تم مجھ سے غلط قسم کی توقعات وابستہ نہ کر لو۔ یہ چیزیں آئندہ چل کر پریشانی کا باعث بنیں گی۔ اس لیے میں چاہتا ہوں چند باتوں کی وضاحت کر دوں۔ کیا کر دوں ؟

"ہاں ہاں" وہ خوش بھی تھی لیکن اس خوشی کی تہہ میں ایک ہلکی سی گھبراہٹ بھی تھی۔

"بیٹا میں بڑا صاف گو آدمی ہوں۔ محبت میں انسان محبت کی چمک سے آگے نہیں دیکھتا۔ مجھے بھی ایسے خوبصورت وقت میں ایسا کھٹکنے والا موضوع نہیں چھیڑنا چاہیئے تھا جو پھیکا کڑوا اور اپنے اندر بوریت لیے ہوئے ہو۔ پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ تم اسے غور سے سنو۔ سناؤں ؟"

"ہاں۔ ہاں سنایئے میں سن رہی ہوں۔ لیکن آپ مجھے اتنا ڈرا کیوں رہے ہیں۔"

"میں تمہیں تو نہیں ڈرا رہا۔ خود تم سے ڈر رہا ہوں۔ اسی لیے تو اپنی خاص خاص کمزوریوں کا اظہار کر دینا چاہتا ہوں۔

"اب کہیئے بھی"

بینا تم کافی سمجھدار ہو، تمہیں پتہ ہے زندگی صرف تخیل کا نام نہیں۔ کچھ حقائق ہیں جن سے زندگی کی جنگ میں نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے؟"

"ہے تو"

بس یہی میں تمہیں کہنا چاہتا تھا۔ مشکلات ہر ذی روح کی زندگی سے ٹکرا سکتی ہیں۔ انسان کو آنے والے حالات کا پتہ نہیں ہوتا اگر کبھی برا وقت آگیا تو کیا تم میرا ساتھ دے سکو گی۔"

"کیوں نہیں"

"تم نے یہ بات کہتے وقت بڑی عجلت سے کام لیا ہے حالانکہ تمہیں جو کچھ کہنا تھا بڑا سوچ سمجھ کر کہنا چاہیئے تھا۔ صرف کہنا کوئی چیز نہیں ہے۔ بڑی بات تو عمل ہے۔ تم ایک مرتبہ پھر سوچ لو کہ اپنے کہے پر عمل بھی کر سکو گی۔"

"آپ مجھے ایسا کیوں سمجھتے ہیں۔"

میں تم سے معافی چاہتا ہوں لیکن میں ہر بات تم پر واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ تمہارے لیے یہ جاننا نہایت ضروری ہے

کہ میں درمیانے طبقہ کا آدمی ہوں۔ صرف سفید پوشش۔ نہ میرے پاس لاکھوں روپے ہیں نہ کسی بڑی جائداد کا مالک ہوں"

"مجھے آپ کی جائداد سے تو شادی نہیں کرنا۔"

"تیسری بات یہ ہے کہ تمہیں میری آمدنی کے مطابق خرچ کرنا ہوگا میں مقروض ہونا پسند نہیں کروں گا۔"

"یہ تو آپ نے بڑی بھونڈی بات کہی"

"شکریہ مینا۔ مجھے بات کہنے سے پہلے بھی یہ احساس تھا کہ یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ لیکن یہ اپنی جگہ بہت اہم تھی۔

تمہاری طرح مجھے بھی یہ باتیں کچھ اچھی نہیں لگتیں مینا۔ مگر آئندہ زندگی میں ہمارا ان پھیکی باتوں سے ہر وقت کا واسطہ رہے گا۔ اس لیے آج چند لمحے اگر کڑوے بھی گزر گئے ہیں تو اس میں کوئی ایسا بڑا نقصان بھی نہیں ہوا"

وہ ہنسنے لگی۔ چھوڑیئے ان باتوں کو جب وقت آئے گا دیکھا جائے گا۔ آپ کی خوشی کے ساتھ میری خوشی ہے۔ کوئی عورت یہ کبھی پسند نہیں کرتی کہ اس کا ساتھی مصائب میں گھرا ہوا اور وہ اسے اپنی آرائش یا آسائش کے لیے تنگ کرتی رہے۔"

"مجھے تم سے یہی اُمید تھی۔ تمہارا شکریہ کہ آج تم نے اتنی دیر تک میری روکھی پھیکی باتیں سنیں۔ میں نے تمہیں کافی بور کیا ہے۔"

"آپ شرمندہ کر رہے ہیں میں تو بہت خوش ہوں کہ آج آخر میری درخواست قبول ہو ہی گئی۔"

اس کی امی اس دوران میں دو دفعہ آچکی تھیں اور دروازے کے پیچھے سے ہی مڑ گئی تھیں۔ میں نے اسے کہا کہ "تمہاری امی شاید انتظار کر رہی ہیں میں کل پھر آجاؤں گا۔"

"نہیں آپ بیٹھیں"

"آج تو بڑا تکلف برتنے لگی ہو۔"

ہم دونوں ہنسنے لگے۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔ میں ذرا اس کی طرف بڑھا۔ وہ کچھ گبھرائی۔ میں نے اس کو چھونا چاہا۔ وہ پیچھے ہٹ گئی۔ میں آگے بڑھتا گیا۔ وہ پیچھے ہٹتی گئی۔ جلد ہی دیوار پر جا کر اس پشت لگ گئی۔ میں اس سے ذرا سے فاصلے پر کھڑا تھا۔ میں نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

"نہیں.... ابھی نہیں"

"کیوں؟"

"شادی کے بعد"

"شادی سے پہلے ہاتھ ملانا منع ہے کیا؟"

"ہاں" وہ ہنسنے لگی

"اچھا اب لاؤ بھی ہاتھ تمہیں بھی دیر ہو رہی ہے۔"

اس نے اپنے دونوں ہاتھ پیچھے کر لیے۔ میرا ہاتھ ہوا میں معلق رہ گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور اسے زور سے دبایا۔ اس کا رنگ سرخ ہو گیا۔ یہ خوشی کا رنگ تھا۔ اس خوشی کا جو اس کے جسم میں ایک

برقی لہر کی طرح دوڑ گئی تھی۔ میں جلدی سے سیڑھیاں اتر آیا۔

O

اب ہم قریب قریب روز ملنے لگے تھے۔ اگر میں کسی دن نہ جاتا تو لوکل ڈاک سے اس کی رومان میں ڈوبی ہوئی لطیف سی چھٹی آجاتی۔ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ ہم ملاقات کرتے اور پوسٹ کی ہوئی چھٹی بعد میں ملتی۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ میرے وہاں بیٹھے بیٹھے میری ہی چھٹی پوسٹ مین لے آیا۔ میں اس سے چھٹی مانگتا اور وہ اسے جلدی سے سینے کے ساتھ چمٹا لیتی۔ میں کہتا میں تو بتا چکا ہوں جو اس میں لکھا تھا مگر وہ اسے اپنے قبضے میں رکھنے پر مُصر رہتی۔

وہ میرے خیالوں میں بستی تھی۔ میری روح کی گہرائیوں میں پہنچ چکی تھی۔ میں اسے دل کی عمیق ترین گہرائیوں سے پیار کرنے لگا تھا۔ اب وہ میری زندگی تھی اور میں ہمیشہ اسی کے تصورات میں کھویا رہتا تھا۔ باقی زندگی کے ساتھ میری دلچسپیاں بہت کم رہ گئی تھیں۔ میں دوستوں سے بھی بہت کم ملتا تھا۔ مجھے میری زندگی مل چکی تھی۔ مجھے کچھ اور چاہیے بھی نہ تھا۔

ایک کانٹا تھا جس کی چبھن میں محسوس کرتا رہتا تھا۔ وہ تھا شادی کا مسئلہ جو میرے لیے بہت اہم تھا۔ وہ باقاعدہ قسم کی شادی چاہتی تھی۔ میں نے اسے سول میرج کا مشورہ دیا تھا مگر اس نے اترا کر کہا تھا میں تو سب عزیز و اقارب کو مدعو کروں گی۔ مجھے اس کی ان عجیب و غریب بوالعجبیوں پر

ہنسی بھی آتی - میں کہتا تم مجھے کیوں مسخرہ بنانے پر تلی ہوئی ہو - اس میں بھلا کیا تک ہے - اچھا بھلا آدمی اپنے آپ سے بیزار سا ہو جاتا ہے - مگر وہ پڑھی لکھی ہونے کے باوجود بضد تھی کہ وہ تو باقاعدہ قسم کی روایتی شادی کرے گی - وہ مجھے باقاعدہ قسم کا دولھا بنا دیکھنا چاہتی تھی - نہ جانے اس کی تہہ میں کون سا جذبہ پوشیدہ تھا -

وہ ایک ماڈرن لڑکی تھی مگر اسے مشرقی دلہن بننے کا دیوانگی کی حد تک شوق تھا - میں نئے دور کا آدمی تھا - مجھے یہ سب کچھ عجیب سا لگتا تھا - مجھے تو اس خیال ہی سے وحشت سی ہونے لگتی تھی - پھر یہ بھی احساس تھا، میرے دوست یہ ڈھونگ سا دیکھ کر کیا کہیں گے - ان کے لیے تو میں تماشہ بن جاؤں گا - میں نے اس کے سامنے ہر پہلو سے دلائل پیش کیے مگر وہ اپنی ضد چھوڑنے والی کہاں تھی -

یہی کانٹا تھا جو مجھے پریشان کرتا رہتا - اس کا دوسرا اہم پہلو یہ تھا کہ اقتصادی طور پر بھی میرے حالات اتنے بڑے معرکے کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے - میرے گھر والوں سے تعلقات کب کے بگڑے ہوئے تھے - میں نے اپنے متعلق ہر بات اسے بتا دی تھی - اپنی کمزوریوں کا ذکر کر دیا تھا - لیکن یہ ایک بات چھپائے رکھی تھی - انسان آپس میں کتنا بھی بے تکلف ہو، کوئی راز ایسا بھی ہوتا ہے جسے وہ اپنے ہمراز پر افشا نہیں کرتا - گھر والوں سے میں کسی قیمت پر بھی ملنے کو تیار نہ تھا - عتیق کے معاملے میں کشیدگی کے بعد، گھر سے پہلا قدم باہر رکھنے سے پہلے میں نے یہ قسم کھائی تھی کہ اپنی زندگی میں

کبھی اس گھر میں قدم نہیں رکھوں گا۔"

یادوں کے دیپ جلنے لگے۔ عتیق نے مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ گھر والوں سے اختلاف بھی محض عتیق کی وجہ سے ہوا تھا اور اب وہ سلسلہ ہی نہ رہا تھا ——— مجھے عتیق والا سارا واقعہ یاد آگیا۔ گھر والوں کے خلاف نفرت میں ابھی تک کوئی کمی نہ آئی تھی۔ عتیق اس وقت میرے لیے کوئی اہم مسئلہ نہیں تھی۔ پھر بھی جانے کیوں اپنے عزیز واقارب کے خلاف میرا غصہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ میں نے غلطی کی تھی جو اُن پر بھروسا کیا تھا ورنہ عتیق کو اپنا بنا لینا کوئی بڑی بات نہ تھی اور اپنے حالات کو اس قدر مخدوش ہونے سے بچا لینا بھی چنداں مشکل نہ تھا۔ صرف تھوڑی سی احتیاط کی ضرورت تھی۔

ایک بار میرا جی چاہا میں اپنے اس کمزور پہلو سے مینا کو آگاہ کر دوں آخر اس میں حرج بھی کیا ہے، پھر وہ کوئی بیگانہ بھی نہیں ہے۔ ہمارے دکھ سکھ اکٹھے ہیں۔ لیکن پھر یہ سوچ کر کہ شاید مینا بدظن ہو جائے میں خاموش رہا۔

ایک دن ایک بارونق بازار میں میرے بڑے بھیا مل گئے۔ دیکھتے ہی مجھے گلے سے لگا لیا۔ یہ میرے بھائی بھی تھے اور بہترین دوست بھی۔ چند سال وہاں گزارنے کے بعد حال ہی میں انگلینڈ سے آئے تھے۔ مجھے ڈھونڈتے رہے تھے مگر میں انہیں کہیں ملا ہی نہ تھا۔ عتیق والا سارا حادثہ ان کی عدم موجودگی میں ہوا تھا۔ مگر یہاں پہنچتے ہی ان کو سارے معاملے کا پتہ چل گیا تھا۔

اور انہوں نے میری غیر حاضری ہی میں میری طرف سے خوب خوب وکالت کی تھی مگر اب تو وقت ہی گزر چکا تھا۔

انہوں نے مجھے کئی دلائل سے قائل کرنا چاہا۔ وہ اس بات پر مصر تھے کہ میں واپس گھر چلا آؤں۔ میں اپنی تمام تر دقتوں سے آگاہ ہونے کے باوجود ان کی اس بات پر متفق نہ ہوا۔ انہوں نے اپنی دوستی کا اپنی محبّت کا واسطہ دیا۔ یہ بھی کہا کہ اب سب اپنی غلطی کا احساس ہو چکا ہے مگر میرا دل ذرا نہ پسیجا۔

وہ ہمّت ہارنے والے نہیں تھے۔ مجھے ملتے رہے۔ میں نے اس شرط پر انہیں اپنا پتہ بتا دیا تھا کہ وہ کسی اور کو نہیں بتائیں گے۔ چنانچہ وہ اپنے وعدے کے پابند رہے۔ وہ بڑے دُور اندیش تھے۔ انہوں نے دُور کی سوچی تھی۔ غیر محسوس طریقے پر وہ میرے ذہن پر چھا چکے تھے۔ اور اسی طرح آہستہ آہستہ ان کا فلسفہ میرے دل میں گھر کرتا گیا۔ اب وہ مجھے مجبور تو نہ کرتے تھے کہ میں ضرور گھر جاؤں مگر ان کا ایک الگ سا انداز تھا جو میرے دل میں ایک احساس سا پیدا کر رہا تھا۔

بینا مجھے روز ہی شادی کے متعلق پوچھتی تھی اور میں اسے ہنس ہنس کر ٹالتا آ رہا تھا۔ لیکن اب میں نے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ اس طرح میں زیادہ وقت نہ گزار سکوں گا۔ ہر ملاقات پر شادی کے بارے میں بینا کی طرف سے سوالوں کی بوچھاڑ ہوتی۔ میں اس کے ہر سوال کا جچے تلے الفاظ میں مناسب جواب بھی دیتا۔ مگر کبھی کبھی تو میں اپنے آپ کو بے بس سا محسوس کرنے لگتا تھا۔ یہی وہ موقعہ تھا جب مجھے آپ کے گھر والوں کی اہمیت کا احساس ہوتا اور شاید

یہی وہ بات تھی جس نے مجھے گھر والوں سے صلح پر اُکسایا۔ ہو سکتا ہے اس میں بھتیا کے خلوص کو بھی دخل ہو۔ میں نے بھتیا کے سامنے اپنی یہی شرط پیش کی۔ انہوں نے نہ صرف بلاحیل وحجت اسے مانا بلکہ خوشی کا بھی اظہار کیا اور لگے دوستانہ چٹکیاں بھرنے۔

یہ مرحلہ طے ہونے کی دیر تھی کہ میں لاکھوں میں کھیلنے لگا۔ ایک بڑی مِل میری ملکیت تھی۔ اس کے علاوہ زمین میں بھی میرا حصّہ تھا۔ اب مجھے اپنی زندگی میں کوئی رکاوٹ نظر نہ آرہی تھی۔ میں نے مینا پر بھی یہ راز افشا کر دیا۔ دراصل اس کو اور چھپانا اب میرے بس میں بھی نہیں رہا تھا۔ وہ بہت خوش ہوئی۔ اور ہم آنے والی سنہری زندگی کے متعلق پروگرام بنانے لگے۔

○

وہ سبز ریشمی سوٹ اور اسی کے ساتھ میچ کرتے ہوئے دوپٹے میں کوہ قاف کی پری لگ رہی تھی اور میرے دل میں گدگدی سی ہو رہی تھی۔

میں نے بڑے پیار سے اُسے دیکھا۔ اسے شاید اپنے حسن کی اہمیت کا احساس تھا اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس وقت اس کی ادا کا تیر عین نشانے پر جا کر لگا ہے۔ میں نے اس خیال سے کہ وہ زیادہ متکبر نہ ہو جائے اپنے جذبات کو چھپانا چاہا۔ مجھے شرارت سوجھی۔ میں نے اپنے بوٹ کی نوک پر جمی ہوئی گرد کی تہہ اس کی نرم نرم ریشمی شلوار سے پونچھ دی۔ اس نے فوراً جوابی حملہ کیا اور اپنی سینڈل میری بہترین گرم پتلون پر رگڑ دی۔ یہ اس میں

خاص بات تھی کہ اس سے ذرا بھی تحمل نہ ہوتا تھا۔ فوراً انتقام لے لیتی تھی۔ اگر ہم کبھی باتوں باتوں میں جھگڑ پڑتے تو میں اسے کہتا:۔

" اگر پوری دنیا کے سانپوں کا زہر اکٹھا کر لیا جائے تو اس سے کہیں زیادہ مجھ اکیلے میں ہے "

" مجھ میں بھی ہے " وہ فوراً جواب دیتی

مجھے ہنسی آجاتی۔ میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتا۔۔" دیکھو بھلی لوگ اگر مجھے کسی وقت غصہ آجائے تو تو ضبط کر لیا کر جس وقت تمہارا پارہ چڑھا ہُوا کرے گا۔ میں برداشت کر لیا کروں گا۔ ہماری کامیابی اسی میں ہے۔ جس طرح تم کرتی ہو، اس طرح گزارہ نہیں ہوتا۔ تمہارا ابھی سے یہ حال ہے آگے چل کر کیا ہوگا۔ تم تو مجھ سے روز لڑا کرو گی۔ پھر بات کیسے بنے گی؟ "

" آپ شادی کب کر رہے ہیں۔ اب دیر کس بات کی ہے۔"

" بس صرف اتنا انتظار ہے کہ تم ذرا سمجھدار ہو جاؤ "

" آپ کے خیال میں میں ابھی بالغ نہیں ہوں "

" یہ تو میں نے نہیں کہا۔ میں نے تو سمجھداری کی بات کی ہے۔"

" ویسے مجھے شک ہے کہ تم ذہنی طور پر بالغ نہیں ہو۔"

" اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ میں بے وقوف ہوں "

" میں نے یہ تو نہیں کہا۔ نا اتنی جرأت کر سکتا ہوں۔ تم جو جی میں آئے سمجھتی رہو۔"

" آپ چاہتے کیا ہیں؟ "

"تم تو یوں ہی بگڑ رہی ہو بھاگوان۔ میں تو صرف اتنا چاہتا ہوں کہ ہم دونوں میں افہام و تفہیم کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ کیا یہ بری بات ہے۔ بتاؤ؟"

"اگر میں جھگڑا نہ کروں تو جیسے آپ بہت جلدی شادی کر لیں گے"

اس کے لہجے میں طنز تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مائی سویٹ ہارٹ کیوں نہیں۔ ایسا ہی ہوگا۔ ذرا اپنا رویہ تو بدل کے دیکھو۔ مجھے تو تم سے ڈر لگتا ہے۔ اگر روز اسی طرح مجھ سے لڑتی رہوگی تو پھر زندگی کا کیا حال ہوگا۔ بیچاری پاگل ہو جائے گی۔"

"کون پاگل ہو جائے گی؟"

"زندگی اور کون، میں نے پوری سنجیدگی اور متانت سے کہا۔ وہ ہنس ہنس کر دوہری ہو گئی۔

"آپ بھی کمال ہیں۔"

"بھئی یہی تو میں کہتا ہوں۔ تم نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا اور یہی تم میں خامی ہے کہ میرے کمال کو دیکھتی بھی ہو اور پھر کمال کو مانتی بھی نہیں ہو۔

"یہی تو میرا کمال ہے۔" اور ہم دونوں قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

"ویسے تمہاری قیمتی رائے میں میری باتیں دلچسپ تو ضرور ہونگی۔" میں نے معصوم بن کر پوچھا۔

وہ ابھی ہنس ہی رہی تھی کہ کسی نے دروازے کے پٹ پر دستک دی ......

"ٹیلر ماسٹر میم صاحب" مینا نے نئے سلے ہوئے کپڑے اس سے پکڑ لیے۔ بل کے علاوہ اسے انعام بھی دیا اور رخصت کر دیا .... پتہ نہیں مجھے یہ

یہ چیز کیوں کھٹکتی رہی۔ دو تین دفعہ پہلے بھی ایسا ہی ہو چکا تھا۔ شروع شروع میں تو میں نے اس بات کو محسوس نہیں کیا تھا لیکن پھر یہ بات مجھے چبھنے سی لگی تھی۔ اگر یہ اتفاقی سلسلہ نہیں تھا تو یقیناً بڑی بات تھی۔ ہو سکتا ہے یہ محض اتفاق ہو اس لیے میں نے اس بات کو بھول جانا چاہا مگر پھر بھی وہ سارا منظر میری آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ ایک دفعہ میرے بیٹھے بیٹھے مستری پانچ چھ بجلی کے پنکھے لے کر آ گیا تھا۔ ایک دفعہ ایک آدمی انکم ٹیکس کے کاغذ لے آیا تھا اور مینا نے پوچھا تھا نقد رقم لو گے یا چیک دے دوں۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ مجھے مرعوب کرنا چاہتی ہے۔ بڑی دکانوں کے ٹیلر اتنے مصروف ہوتے ہیں کہ وہ کسی کے گھر جانے کا وقت نکال ہی نہیں سکتے۔ ہماری کوٹھی پر کبھی ٹیلر نہیں آیا تھا حالانکہ ہم اکثر اس سے ہی کپڑے سلوایا کرتے تھے۔ جس ٹیلر سے مینا کے کپڑے سل کر آتے تھے وہ اتنا مصروف اور بڑا ٹیلر تھا کہ کسی کے گھر تو کیا اس کی مصروفیت کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنے گھر بھی باقاعدہ نہیں جاتا ہو گا۔ پھر ان لوگوں کو گھر کے دروازے کی طرف جانے کی بجائے ادھر کا رُخ کیوں کرنا پڑتا تھا۔ حالانکہ ڈیوڑھی کا دروازہ الگ تھا۔ پھر میں سوچتا اگر یہ ڈراما ہی ہے تو مینا کا اتنی جلد اس طرح غیر آدمی کا انتظام کر لینا معجزہ سے کم نہیں۔ آخر یہ سارا پروگرام میرے یہاں پہنچنے کے بعد ہی بنتا ہو گا۔ مجھے اس کی زندگی کا یہ پُرتکلف پہلو بالکل پسند نہ تھا۔ میں خود بھی صاف گو آدمی تھا۔ اور دوسروں سے بھی یہی توقع رکھتا تھا۔ اور اگر کوئی میری توقع کے خلاف نکلتا تو مجھے خواہ مخواہ اس سے نفرت سی ہونے لگتی تھی۔ میں کچھ اسی قسم کے خیالات میں گھر گیا تھا۔ اس نے مجھے گم سم

سا دیکھا تو پھر اپنی سینڈل میری اتنی نفیس پینٹ کے ساتھ رگڑ دی۔

"کیا سوچ رہے تھے آپ۔ کوئی یاد آرہی ہوگی۔"

میں نے اس کے دوپٹے سے پینٹ صاف کرتے ہوئے کہا:۔

"ہاں آ تو رہی ہے۔"

"کون ہے وہ خوش قسمت"

"راز کی باتیں نہیں پوچھا کرتے مِس مینا"

"بڑی خوبصورت ہوگی۔"

"ہاں"

"کتنی ہے"

"چاند ستاروں سے بھی بڑھ کر"

"یہ شاعری مجھے پسند نہیں۔ سیدھی طرح بتائیں، فلاں لڑکی جیسی ہے۔"

"اس جیسی کوئی لڑکی ہی نہیں ہے"

"کسی فلم ایکٹریس کا نام لے دیں۔"

"فلم ایکٹریس اس کے سامنے کیا چیز ہے۔"

"آپ مجھے ستاتے کیوں ہیں۔"

"میں نے جناب کو کچھ کہا ہے؟"

"اچھا نہ بتایئے میں خود ہی کسی وقت دیکھ لوں گی۔"

"وہ کیسے؟"

"آپ کا پیچھا کروں گی"

"پھر کیا ہوگا؟"

"یہ تمہاری بھول ہے۔ وہ کسی کو نظر نہیں آتی اور پھر تمہیں پتہ ہے حسن تو چاہنے والے کی نظر میں ہوتا ہے، محبوب میں نہیں۔ تمہیں بھلا کیا نظر آئے گا اس میں۔"

"اچھا شاعر صاحب معاف کیجئے۔ یہ دیکھئے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ آپ سے بات کر کے پچھتانا پڑتا ہے۔"

اس نے سچ مچ ہاتھ جوڑ دیئے، بات کر کے نہیں بحث کر کے" میں نے اس کے ہاتھوں کو پکڑ کر علیحدہ کر دیا۔ بینو مجھے اتنا گنہگار تو نہ بناؤ۔ تم تو اتنی پیاری ہو کہ تمہیں پوجنے کو جی چاہتا ہے۔"

"جھوٹا پیار۔ کبھی پوجا ہے آپ نے" وہ مسکرا دی۔

"تو تو پگلی ہے۔ پوجا تو دل سے ہوتی ہے۔ باتوں سے نہیں۔"

"عورت واقعی پگلی ہوتی ہے۔"

"میں حیران ہوں تم اتنی پڑھی لکھی ہو پھر بھی شک کرتی ہو۔ تم یہ سوچو اگر مجھے کسی اور سے محبت کرنا تھی تو تمہارے لیے اتنے پاپڑ بیلنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"وہ خوش ہو گئی۔ کہنے لگی

"پتہ نہیں مجھے کیوں ایسا لگتا ہے جیسے آپ میرا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ جب آپ چلے جاتے ہیں تو میرا دل بیٹھنے لگتا ہے۔"

"یہ بات ہے تو لو حضور ہم یہیں جم کر بیٹھے ہیں۔ یہیں کھانا آئے گا یہیں

چائے ملے گی۔ یہیں پر سوئیں گے"

؎ حضرت داغ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے

وہ پھر ہنسنے لگی۔

"آپ شروع سے ہی ایسے شرارتی ہیں"

"ہاں"

"گھر میں بھی ایسا ہی کرتے ہیں"

"ہاں"

"کس کے ساتھ"

"امّی کے ساتھ۔ باجیوں کے ساتھ۔ چھپیوں کے ساتھ۔"

"آپ سے تو تنگ آجاتے ہوں گے سب"

"اگر تم آجاتی ہو تو ان کے متعلق بھی ایسا ہی سمجھو"

اتنے میں نویدؔ اندر داخل ہوئی۔ ہم دونوں نے چپ سادھ لی۔ نویدؔ نے ہم دونوں کو غور سے دیکھا۔ پھر نظریں جھکالیں اور اسی انداز سے مجھ سے پوچھا:۔

"میں مخل تو نہیں ہوئی"

"ہوئی تو ہیں"

اسے بُرا لگا۔ اور وہ ناراض ہو کر واپس مڑ گئی۔ مینؔا نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا

"یہ آپ نے کیا کیا"

"میں نے کیا کیا ہے"

"نوید کو ناراض کر دیا ہے"

"میں نے اسے کیا کہا ہے۔"

"آپ کو ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا"

"اور کیا کہتا"

"کچھ اور کہہ دیتے"

"میں نے کوئی جھوٹ بولا ہے"

"نوید میری بہن ہی نہیں سہیلی بھی ہے۔ اسے بالکل ناراض نہیں کرنا۔ شاید آپ کو معلوم نہیں وہ آپ کو چاہتی رہی ہے اور شاید کافی عرصہ"

"مجھے معلوم ہے"

"پھر بھی آپ ایسا کرتے ہیں۔"

"میں اسے چھیڑنا چاہتا تھا۔"

"یہی چھیڑ چھاڑ تو وہ مجھے آکر بتایا کرتی تھی۔ آپ کی ایک ایک بات روز آکر مجھے سناتی تھی۔ آپ کی شوخیاں اسے بہت پسند تھیں۔ دیر تک آپ کا ذکر لے کر بیٹھی رہتی۔ مجھے آپ سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ مگر کوئی موقعہ ہی نہ ملتا تھا۔ پھر ایک دن مشاعرہ میں آپ سے ملاقات ہو ہی گئی"

"اور تم مجھ پر مر مٹیں"

"ہاں۔ میں خواہ مخواہ کیوں جھوٹ بولوں۔ میں نے نوید کو کہہ دیا تھا کہ آپ مجھے بہت پسند ہیں۔ نوید نے ہنستے ہوئے مجھے چھیڑا تو اُن سے شادی

کر لو۔" میں نے اسے کہا۔ "تم اجازت دے دو تو میں کبھی نہ ٹلوں گی۔" وہ ہنستی رہی، کہنے لگی:۔

"میں تمہیں روکتی ہوں یا اُن کو پکڑ رکھا ہے۔" میں نے کہا "اس طرح نہیں اپنی خوشی سے انہیں میرے حوالے کر دو۔ میں تمہارا احسان ساری زندگی یاد رکھوں گی۔" وہ پہلے تو اسے مذاق ہی سمجھتی رہی پھر سنجیدہ ہو گئی۔ میں نے کہا۔ "ایک ملاقات کرا سکتی ہو۔" کہنے لگی میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ وہ من موجی آدمی ہیں۔ پل میں ماشہ، پل میں تولہ۔ جی میں آئے تو ہنسا ہنسا کر پیٹ میں بل ڈال دیتے ہیں۔ موڈ خراب ہو تو ڈانٹ دیتے ہیں۔ کئی دن بولتے ہی نہیں۔ وہ ابھی تک کسی کی سمجھ میں نہیں آئے۔" پھر اس نے بتایا۔ "وہ شاید فراست ہما سے محبت کرتے ہیں۔ مذاق ہی مذاق میں اسے بہت کچھ کہہ جاتے ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اس تفریح کے پردے میں سچ مچ محبت کرتے ہیں۔ اُن کو فراست ہما بہت پسند ہے۔ وہ ہے بھی تو خوبصورت۔ لیکن وہ طرح دے جاتی ہے۔ تم بھی اپنی قسمت آزما دیکھو۔ مجھے تو اپنی ہار ابھی سے نظر آ رہی ہے۔" نوید یہ سب کچھ جذبات کی رو میں کہتی رہی تھی اور میں بُت بنے ہنستی رہی تھی۔ پتہ نہیں میرا دل کیوں گواہی دے رہا تھا کہ میں اپنے ارادوں میں کامیاب ہو جاؤں گی۔ میں بھی اُسی وقت خیالات میں کھوسی گئی تھی۔ جب کافی وقت گزر چکا تو میں نے سمجھنے کی کوشش کی۔ نوید نے بھی ہنسنا چاہا لیکن وہ اپنی متعدد کوششوں کے باوجود ہنس نہ سکی۔ میں پھر سنجیدہ ہو گئی۔ میں نے اسے کہا "تم کوشش تو کرو۔ شاید وہ آ جائیں۔"

اس لیے میں نے شکریہ کا پیغام بھیجا تھا اور آپ نے بھی نوید کو اپنی طرف سے شکریہ کا پیغام دینے کے لیے کہا تو اُس نے صاف انکار کر دیا۔ آپ کو یاد ہو گا اس نے کہا تھا۔ "آپ خود جا کر شکریہ ادا کر آئیں۔" چنانچہ آپ کو اپنا اخلاقی فرض سمجھ کر یہاں تک آنا ہی پڑا۔ نوید نے باتوں باتوں میں آپ سے پوچھا کہ آپ شادی شدہ تو نہیں ہیں۔ آپ نے انگلینڈ کی بات چھیڑی تو میں اگرچہ ہنستی رہی مگر میں مایوس ہو گئی تھی۔ پھر بھی میں نے ہمت نہیں ہاری۔ اور آج آپ میرے بن چکے ہیں۔"

میں نے اس کی باتیں ہمہ تن گوش ہو کر سنی تھیں اگرچہ راہ میں مجھے کئی دفعہ سوجھی کہ اسے چھیڑوں مگر باتوں کا تسلسل کچھ ایسا تھا کہ مجھے موقعہ ہی نہ ملا اور جب وہ اپنی بات ختم کر چکی تو میں اس سے بھی زیادہ سنجیدہ ہو چکا تھا۔

مینا اسے منانے کے لیے چلی گئی اور میں چاہت کے فلسفہ پر غور کرنے لگا۔ چاہت کی حدیں کتنی وسیع ہیں۔ بعض لوگ اسے کتنا محدود کر دیتے ہیں اور اس کے لیے کیسا عجیب و غریب استدلال پیش کرتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ ایک ایسا جذبہ ہے جس کی گہرائی اور گیرائی ناپی نہیں جا سکتی۔ یہ صرف محسوس کرنے کی چیز ہے۔ میں ابھی اس الجھن سے جدا نہیں ہوا تھا کہ نوید اور مینا اندر آئیں۔ میں نے نوید کا ایک ہاتھ پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ میرا خیال تھا میری اس شدخی پر وہ ہنس دے گی مگر اس نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا۔ میں نے اسے کہا:۔

"میں نے تمہیں اپنے سے چھوٹا سمجھ کر پیار کیا ہے۔"

"بڑے لوگ سب کو اپنے سے چھوٹا ہی سمجھتے ہیں۔ اس کے لہجے میں سخت قسم کا طنز تھا۔

"تم واقعی مجھ سے ناراض ہو نوید"

"جی نہیں۔ میری وقعت ہی کیا ہے۔" اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ مجھے دھچکا سا لگا۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ میں اس کا دل نہیں دکھانا چاہتا تھا۔ مگر تفریح میں یہ سب کچھ ہو گیا تھا۔ میں اس کا تریاق سوچنے لگا۔ مگر مجھے تو کچھ بھی نہ سوجھ رہا تھا۔ میں نے ایسی نظروں سے اس کی طرف دیکھا جس میں ایک خاص درخواست تھی۔ یہ مضمون اس نے بھی پڑھ لیا۔ اس کے دل کی کدورت کسی حد تک دور ہو گئی۔

بینا نے اس کی توجہ نئے سلے ہوئے کپڑوں کی طرف دلائی۔ اس میں دو ایک فراک اس کے بھی تھے۔ وہ انہیں پہن کر دیکھنے کے لیے دوسرے کمرے میں لے گئی۔ میرے جی میں کھد بدسی ہونے لگی۔ میں نے کہا:۔

"ذرا تم بھی تو پہنو۔ میں بھی دیکھوں ان کپڑوں میں کیسی لگتی ہو۔"

"آپ کے سامنے ہی پہنوں"

"ہاں"

"توبہ توبہ" اس نے کانوں کو ہاتھ لگا لیے "آپ کیسی باتیں کرتے ہیں"

"اب اتنا بھی پردہ کیا۔ کیا مجھے ہمیشہ غیر ہی سمجھتی رہو گی۔

"اجی مجھے پھسلایئے نہیں۔ میں آپ کی باتوں میں آنے والی نہیں"

"یہ تم نے کوئی نیا انکشاف نہیں کیا۔ جناب کے متعلق میں بہت کچھ

جانتا ہوں۔ میری بھی ناقص رائے ہیں آپ میری باتوں میں آنے والی نہیں ہیں۔ پھر بھی اب ان کو ذرا پہن ہی لو۔

" کہہ تو یوں رہے ہیں جیسے خود ہی تو بنوا کر دیئے ہیں "

" تم ٹھہریں امیر کبیر۔ میں غریب سا آدمی بھلا اتنے اعلیٰ ملبوسات کہاں سے لا سکتا ہوں۔"

" دیکھا جب مجھے کچھ دینے کی باری آتی ہے تو غریب آدمی بن جاتے ہیں اور خود کیسے کیسے قیمتی سوٹ پہنتے ہیں۔ ہر وقت بنے ٹھنے رہتے ہیں۔"

" یہ تو تمہیں دکھانے کے لیے پہن لیتا ہوں۔ ڈرائی کلینر کی دکان سے ادھار لایا تھا۔"

" اچھا جی اچھا۔ یہ کیوں نہیں کہہ دیا پرانے کپڑوں کی دکان سے کرایہ پر لایا تھا۔"

" میرے پاس اپنے جو ہیں وہ تو واقعی اسی دکان کے ہیں "

" غریب جو ہوئے "

" جی ہاں اس میں کیا شک ہے "

" اور یہ جیب میں اتنا سارا کیا ہے۔"

اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا اس نے سارے نوٹ نکال لیے۔

" یہ فضول سے کاغذ ہیں "

اس نے انہیں اپنے پرس میں رکھ لیا۔

" یہ فضول کاغذ آپ کے کس کام " وہ خوش تھی۔

میں نے کہا۔ " ٹکٹ کے لیے پیسے تو دیدو۔ واپس کیسے جاؤں گا۔"

"میں تو کچھ نہیں دوں گی جیسے جی چاہے جائیے۔"

"اچھا ادھار ہی دے دو"

"نوید سے لے لیجیے"

وہ اسے بلانے کے لیے چلی گئی مگر وہ نہیں آئی۔ مجھے بیٹھے بیٹھے کچھ اس طرح کی آواز آئی اور احساس ہوا جیسے باہر بارش ہونے لگی ہے۔ مینّا اندر داخل ہوئی تو میں نے اس سے پوچھا۔

"باہر بارش تو نہیں ہو رہی"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ مجھے فکر لاحق ہوئی۔ اب کیسے گھر پہنچونگا۔ میں نے کہا۔

"گلی میں ٹانگا آجاتا ہے"

"نہیں"

"کیا بہت کیچڑ ہو جاتا ہے"

"ہاں"

"پانی کھڑا ہو گیا ہوگا"

"ہاں"

"تو اب میں کیسے جاؤں"

"پیدل"

"یہ تو بڑی مصیبت ہوگی"

وہ میری طرف دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔ اس کی تمام تر توجہ نے ڈسلے ہوئے

کپڑوں پر تھی۔ میں نے اسے پھر چھیڑا۔

" تمہارے پاس اتنے کپڑے ہیں مگر پھر بھی نئے کپڑوں پر بچھی جا رہی ہو۔ کپڑے اور زیورات عورت کی کمزوری ہے۔"

" بالکل غلط، دیکھیے میں نے تو کوئی زیور بھی نہیں پہن رکھا۔"

" اب پڑھی لکھی لڑکیاں اسے فیشن کے خلاف سمجھنے لگی ہیں۔ عام عورتیں تو اب بھی زیورات کی دلدادہ ہیں۔"

" اس کا مطلب ہے آپ عورتوں کو دیکھتے رہتے ہیں۔"

" لاحول ولا۔ تم بھی خوب لڑکی ہو۔ تمہاری گرفت سے بچنا ناممکنات میں سے ہے۔ اچھا اب برائے مہربانی ذرا یہ فراک تو پہن کر دکھا دو۔"

" نہیں "

" کیوں "

" بس نہیں "

" تم تو جنگ کرنے پر تلی بیٹھی ہو۔ اچھا ٹھہرو۔ میں سمجھوتے کی ایک صورت پیدا کرتا ہوں۔ تم اس فراک کے اوپر اسے پہن لو "

میں نے نیا فراک اس کے کندھوں کے ساتھ لگا کر دیکھا وہ کافی لمبا بھی تھا اور کھلا بھی۔ مجھے اس کے ذوق کی سمجھ نہیں آتی تھی۔ کبھی تو فراک اس کے جسم کے ساتھ چپک کر رہ جاتے اور کبھی وہ بالکل ڈھیلے ڈھالے فراک پہنتیں۔ ہاں ایک خصوصیت ان ڈھیلے ڈھالوں فراکوں میں خاص یہ تھی کہ جسم کی تمام قوسیں ان میں نمایاں نظر آنے لگتی تھیں۔ وہ نہ نہ کرتی رہی اور میں نے فراک اٹھا کر اس کے

گلے میں پھنسا دیا۔ وہ ہنستے ہوئے کہنے لگی۔

اچھا ٹھہر جایئے میں خود ہی پہن کر دکھاتی ہوں۔

"آپ بڑے ضدی ہیں"

"تم کیا کم ہو"

نسواری بڑے بڑے پھولوں والا کھلے گلے کا فراک اسے بڑا ہی خوبصورت لگ رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"میں سچ کہتا ہوں تم اس وقت بالکل شہزادی لگ رہی ہو۔"

"واقعی"

"میں تمہیں بنا تو نہیں رہا۔ کتنی خوبصورت لگ رہی ہو"

"فراست ہما سے بھی زیادہ" اس نے مجھے چھیڑنا چاہا......

میں خاموش ہو گیا۔

"اب چپ کیوں ہو گئے ہیں۔ میں سب جانتی ہوں۔

"یہ محض تمہارا وہم ہے۔"

"میری قسم کھایئے۔"

"تمہاری قسم۔ بس"

"اچھو کو بھی آپ پسند نہیں کرتے"

"اچھی لڑکی ہے"

"دیکھا"

"بھئی میں نے یہ تو نہیں کہا کہ مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے۔"

"رہی تو ہے"

"نہیں"

"نوید کہتی تھی"

"تمہیں اچھا بھلا پتہ ہے کہ میں سب کو چھیڑ دیتا ہوں۔ یونہی تفریحاً ویسے ہی۔"

"چھوڑیئے چھوڑیئے میں سب سمجھتی ہوں"

وہ فراک اتارنے لگی۔ میں نے اس کے دونوں بازو پکڑ لیے۔

"ذرا رہنے دو چبھتا ہے کیا؟"

"ہاں"

"تم ہر اس بات کے الٹ چلتی ہو جو مجھے اچھی لگتی ہے۔"

دیکھیے اب کوئی آجائے تو کیا ہوگا۔ پاگلوں کی طرح دو فراک اوپر نیچے پہنے ہوئے ہیں۔ آپ تو یونہی ضد کرتے رہتے ہیں۔ چھوڑیئے کہیں نوید نہ آجائے۔"

"پھر کیا ہے۔ وہ تھوڑا سا ہنس لے گی اور کیا ہوگا۔"

میں نے اس کے بازو پکڑ لیے۔ وہ سنجیدہ ہو گئی۔

"روٹھ گئیں"

اس نے اپنے دونوں بازو چھڑانے کی کوشش کی۔ میں اپنا منہ اس کے قریب لے گیا۔ اس نے سر کو ادھر ادھر کیا تو میرے کوٹ سے اس کے سر کے بال رگڑ کھا کر کچھ بکھر سے گئے۔ وہ مجھے اتنی پیاری لگی کہ میرے لیے سنبھلنا مشکل ہو گیا۔ میں نے اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیے۔

نوید آئی تو ہم دونوں علیحدہ ہو چکے تھے مگر اس کے بال ابھی تک بکھرے

ہوئے تھے۔ وہ جلدی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ نوید بھی اس کے پیچھے پیچھے چلی گئی۔ دو ایک منٹ کے بعد نوید آئی تو مسکرا رہی تھی۔ بینا نے شاید ساری بات اسے بتا دی تھی۔ مجھے حیران سا دیکھ کر اس کے لبوں پر مسکراہٹ اور پھیل گئی۔ کہنے لگی:۔

"بینا کہتی ہے کان پکڑ لیجیئے"۔

"آپ کے یا اس کے۔" میں نے بڑے بھولپن سے پوچھا۔

وہ ہنستی ہنستی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اتنے میں بینا آ گئی۔ نوید بھی اسی لمحہ پھر واپس آ گئی۔ مسکرا کر کہنے لگی۔

"اپنے"

میں نے اپنے دونوں کان پکڑ لیے۔ تو وہ دونوں ہنستے ہنستے دوہری ہو گئیں۔ اب بارش کی آواز بھی بند ہو گئی تھی۔ کافی دیر ہو چکی تھی۔ میں اٹھنے لگا تو مجھے یاد آیا میرے پاس پیسے بالکل نہیں ہیں۔ میں نے نوید سے مدد مانگی تو اس نے مسکراتے ہوئے ایک نوٹ مجھے دے دیا۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور نیچے اتر آیا۔

باہر اچھی بھلی دھوپ چمک رہی تھی۔ بارش کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ میں حیران ہوا، وہ آوازیں میں نے کس چیز کی سنی تھی۔ شاید وہ محض میرا خیال تھا۔ میرے استفسار پر بینا نے مجھ سے آنکھیں نہ ملائی تھیں۔ میں اس کی شرارت سمجھ گیا تھا۔

O

میں خود بیتابی سے ملنے کے لیے بے چین تھا کہ اس کا ایک پیارا سا خط ملا۔ اس نے لکھا تھا :-

" ہر سو سناٹا ہے۔ متنفس سو رہے ہیں۔ اونگھتے ہوئے در و دیوار کے سائے خاموشی سے لیٹے ہیں۔ آدھی رات گزر چکی ہے۔ باہر ہلکی ہلکی مترنم بوندا باندی ہو رہی ہے۔ بوندا باندی کی مترنم آواز میرے دل میں ہلچل سی پیدا کر رہی ہے۔ آپ کی حسین یادیں اس تنہائی میں میری رفیق ہیں۔ گزرے ہوئے سنہری لمحے ایک ایک کر کے میری آنکھوں کے سامنے پھر رہے ہیں۔ آپ کی شوخیاں میرے لبوں پر مسکراہٹیں بکھیر دیتی ہیں۔ پھر میں سوچوں میں ڈوب جاتی ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ شہزادی کے ہاتھ سے سنہری پرندہ اڑ جائے۔ یہ سوچ کر تفکرات کی اندھیری میں تنہا ایک بے سہارا اور کمزور تنکے کی طرح اڑنے لگتی ہوں۔ اس وقت مجھے کسی مضبوط سہارے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ میں آپ کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہوں۔ آپ اندھیرے میں گم ہو جاتے ہیں۔ مجھے روشنی کی تلاش ہے۔ کیا آپ میرا ہاتھ پکڑ کر روشنی کی تلاش ہے۔ کیا آپ میرا ہاتھ پکڑ کر روشنی تک نہیں لے آئیں گے ؟ کہیں آپ انکار نہ کر دیں۔ میرا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ مجھے آپ کے بغیر خوف سا محسوس ہو رہا ہے۔ کیا آپ جلدی سے نہیں آ سکتے۔

میں نے پتہ نہیں آپ کو کیا کچھ لکھ دیا ہے۔ مگر میں مجبور ہوں۔ دل پر میرا بس نہیں۔

اوپر میں نے کچھ بھی نہیں لکھا۔ مجھے تو ہر لفظ ہر اصطلاح آپ کی شخصیت کے سامنے پھیکی سی نظر آرہی ہے۔ کوئی بھی اصطلاح میرے دل کی ترجمانی مکمل طور پر نہیں کر رہی۔ اس لیے میں نے سوچ سوچ کر تمام الفاظ ترک کر دیئے ہیں اور بغیر عنوان کے خط لکھ دیا ہے۔

میں ابھی سے آپ کا انتظار شروع کر رہی ہوں۔ مجھے یہ لمحے بھاری پتھر محسوس ہو رہے ہیں۔ انتظار واقعی بڑی تکلیف دہ چیز ہے۔ ——————— آپ کی بے تابانہ منتظر

"مینا"

میں نے خط کو بار بار پڑھا۔ میرا جی چاہا میں ابھی مینا سے جا ملوں۔ میں جانے کے لیے تیار بھی ہوا مگر پھر رک گیا۔ مجھے معلوم تھا آج شام وہ میرا بڑی بے تابی سے انتظار کر رہی ہوگی۔ میں خود بھی بے چین تھا لیکن میں نے دانستہ اپنے آپ کو روک لیا۔ میں نے تھوڑا سا راستہ بھی طے کر لیا تھا مگر میں واپس مڑ آیا۔ میں اسے کچھ اور انتظار کرانا چاہتا تھا۔ بس یوں ہی میں نے سوچا ذرا لطف رہے گا۔

زیادہ انتظار تو میرے اپنے بس میں بھی نہ تھا۔ دوسرے دن میں جلدی سے جلدی پہنچنے کی کوشش میں کار کو اندھا دھند بھگائے لیجا رہا تھا۔ سڑک پر استادہ دو رویہ درخت آنکھ جھپکنے سے پہلے پیچھے رہ جاتے۔ مجھے پتہ تھا آج بھی وہ منتظر ہو گی لیکن میں نے اس کا اظہار نہ ہونے دیا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بپھر گئی۔

"آپ کل کیوں نہیں آئے تھے۔"

میں نے معصوم بن کر متانت سے کہا۔

"کوئی ضروری کام پڑ گیا تھا۔"

اس کی نظر خود بخود کاغذوں کے ایک ڈھیر کی طرف چلی گئی۔ میری نظروں نے بھی تعاقب کیا۔ بہت سے کاغذ پھاڑ پھاڑ کر پھینکے گئے تھے۔ میز کے پائے کے پاس چھوٹا سا ڈھیر بن گیا تھا۔ میری سمجھ میں سارا معاملہ آ گیا۔ میں نے کہا۔

"کوئی اچھا سا مضمون نہیں سُوجھا۔"

"بہت کچھ سوجھا تھا لیکن کوئی بھی ایسا مضمون نہ تھا جو میرے غصّہ کی مکمل تصویر اتار سکتا۔"

"اسی لیے سارے خطوط پھاڑ دیئے گئے۔"

"ہاں"

"تو اب بندہ حاضر ہے غصّہ اتار لیجئے"

میں نے گردن جھکا دی۔ وہ مسکرا دی۔ میں نے اسے کہا۔

"تمہیں ایک پرائیویٹ بات بتا دُوں"

وہ بڑے غور سے میری طرف دیکھنے لگی

"بتایئے"

"میں کل جان بوجھ کر نہیں آیا تھا۔"

"کیوں؟"

"میں نے سوچا ذرا مزا رہے گا"

وہ پھر روٹھ گئی - مجھے پھر منانا پڑا - کہنے لگی -

"کل میں نے آپ کی دعوت کا انتظام کیا ہوا تھا ۔"

"ہم اور دعوت" مجھے ہنسی آگئی -

"آپ میرے جذبات کی بالکل قدر نہیں کرتے ۔"

"خدا کے لیے سفید جھوٹ نہ بولو "

"آپ میرے ساتھ جھگڑنے کے لیے آئے ہیں ۔"

"کیا غلطی ہوگئی بندہ سے "

"[illegible] آپ کو بلایا تھا ۔ اچھا وقت گزر جائے گا - میری اداسی دور ہو جائیگی

اور آپ [illegible] طنز کے تیر چلا رہے ہیں"

"اچ[illegible] "

میں [illegible] دونوں کان پکڑ لیے اور وہ ہنسنے لگی -

"آؤ صلح [illegible]" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا -

اس کا پیا[illegible] غصہ اب بالکل ٹھنڈا ہو چکا تھا - میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور آہستہ آہ[illegible] اسے سہلاتا رہا - وہ چپکے چپکے میری طرف دیکھتی رہی - میرے ہاتھ کو اس کی انگوٹھی بار بار روک رہی تھی - میں نے اس کی انگوٹھی انگلی میں آہستہ آہستہ گھماتے گھماتے آرام سے اتار لی - جس وقت اسے بچاؤ کی سوجھی انگوٹھی میرے ہاتھ میں تھی - میں نے اسے اپنی چھوٹی انگلی میں پہن لیا -

"میں نہیں دوں گی "

وہ تو جناب مجھے پہلے ہی پتہ تھا اسی لیے تو بندہ نے اس قسم کی جسارت

کی ہے۔ آپ خود ہی دے دیتیں تو ہم آپ کا ایک عدد شکریہ ادا کر دیتے۔ اب آپ اس سے بھی گئیں۔ انگوٹھی بھی گئی اور آپ کا مجھ پر کوئی احسان بھی نہ ہوا۔"

"میں آپ کو دوہری دے دیتی ہوں"

"دوہری تہری میں کچھ نہیں جانتا۔ میں نے جو لینی تھی لے لی۔ اب جناب ڈنڈے بجا سکتے ہیں۔"

"شکریہ۔ آپ کافی مہذب ہوتے جا رہے ہیں۔"

"آپ کی ہی عنایت ہے"

"مزید شکریہ"

"اچھا اب لڑتی ہی رہو گی یا کوئی بات بھی کرو گی۔ میں آئندہ کبھی نہیں آؤنگا۔ سیدھی صاف بات ہے"

"میں لڑتی ہوں یا آپ لڑتے ہیں"

"اپنے دل میں جھانک کر فیصلہ کر لو"

"اچھا میں ہی گنہگار سہی۔ لیجئے میں معافی مانگتی ہوں۔"

اس نے اپنے دونوں کان پکڑ لیے۔ میں نے اس کے ہاتھ پرے ہٹا کر کانوں کو ذرا سا کھینچ دیا۔

"اس طرح نہیں اس طرح"

"توبہ کتنے بے درد ہیں آپ"

"بس ذرا سی بات سے سی سی کرنے لگی ہو اور مجھے ہر وقت جلاتی رہتی

ہو۔ کچھ میرے دل کا بھی اندازہ ہے تمہیں"

کافی بحث و تمحیص کے بعد ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ آئندہ ہم کبھی کوئی ایسی بات نہ کریں گے جو ایک دوسرے کے لیے باعث رنج ہو۔ ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کریں گے اور ایک دوسرے کے فیصلوں کو تسلیم کریں گے۔

بہت وقت گزر چکا تھا اس لیے میں اٹھ کر چلا آیا۔

○

روٹھنے میں بھی بڑا مزا ہے۔

بات بات پر روٹھنا اور پھر چند لمحات میں من جانا۔ ان اداؤں کو کچھ عشاق قسم کے لوگ ہی سمجھتے اور جانتے ہیں۔ ہر بات پر روٹھ جانا بینا کی خاص ادا تھی۔

وہ بضد تھی کہ شادی بہت جلد ہو جانا چاہیئے۔ میں نے اسے کہا "ابھی ہماری عمر ہی کیا ہے۔ اس جھنجٹ میں ابھی سے پھنس گئے تو پھر ساری زندگی ہوش نہیں آئے گا۔ چند سال اور ٹھہر جاؤ" اس کے لیے تو چند دن بھی صدیوں کے برابر تھے۔ یہ سنتے ہی وہ مجھ سے سچ مچ روٹھ گئی۔ میں نے کہا اچھا اتنا تو انتظار کرو کہ میں ایک ورلڈ ٹور کر آؤں۔ اسے تو جیسے بخار چڑھ گیا۔ کہنے لگی۔

"میں تو کبھی نہ جانے دوں گی"

میں نے وجہ پوچھی تو رونی سی صورت بنا کر کہنے لگی۔

"آپ کا کیا اعتبار"

مجھے ہنسی آ گئی

"کیوں؟"

"آپ ضرور وہاں کسی نہ کسی لڑکی کو پھنسا لیں گے۔"

میں نے اسے بہت سمجھایا کہ لڑکیاں بھیڑیں نہیں ہوتیں جنھیں خریدا جا سکے۔ نہ اتنی بھولی ہوتی ہیں کہ وہ جلدی سے پھنس جائیں۔ مگر اس کے سامنے ہر دلیل ہیچ تھی۔ اور وہ قسم کھائے بیٹھی تھی کہ مجھے کسی قیمت پر بھی انگلینڈ یا امریکہ نہ جانے دے گی۔ بڑے مرحلے طے کرنے کے بعد وہ اس بات پر رضامند ہوئی کہ اگر آپ باہر جائیں تو مجھے بھی ساتھ لے کر جائیں۔

میں نے کہا۔

"تم باہر جا کر کیا کرو گی"

کہنے لگی

"جو آپ کریں گے"

میں نے کہا

"میں تو لڑکیوں سے تانک جھانک کرونگا" خفیف سی ہو کر بیٹھ رہی۔ وہ پھر ناراض ہو گئی۔ اب میں اسے گدگدی کر رہا تھا۔ اس نے روٹھنے کے انداز سے کہا۔

"میں نہیں بولتی آپ سے"

" بولتا تو میں بھی نہیں صرف ہاتھ چلا رہا ہوں "

وہ مسکرا دی۔ ہم دونوں صوفے پر ایک دوسرے سے لگے بیٹھے تھے۔ میں نے اسے اس کا وعدہ یاد دلایا۔

" تم نے تو کہا تھا اب میں آپ کو کبھی نہیں ستاؤں گی "

" یہی الزام اگر میں آپ پر لگا دوں تو "

" میرا خیال ہے نوید کو ثالث مقرر کر لیتے ہیں وہ ہم دونوں کا فیصلہ کر دے گی "

" توبہ ہے۔ آپ کا کیا اعتبار پتہ نہیں آپ اس کے سامنے کیا کیا کہہ دیں۔ آپ تو ذرا بھی نہیں جھجکتے۔ معاف فرمایئے۔ آپ جیتے میں ہاری "

دیکھو جی تمہارے لہجے سے صاف ظاہر ہے کہ تم اکتا کر کہہ رہی ہو یا اکتاہٹ ظاہر کر رہی ہو۔ یہ بات مجھے بالکل پسند نہیں۔ ہار ہی ماننا ہے تو سپورٹس مین سپرٹ کا مظاہرہ کرو۔ یہ کیا آپ جیتے میں ہاری۔ کوئی مہذبانہ انداز تو ہو۔"

وہ روٹھ کر بیٹھ گئی

" آپ تو کسی طرح بھی جینے نہیں دیتے۔ معافی مانگوں تو نقص نکالتے ہیں۔ بات کروں تو نکتے پیدا کرتے ہیں۔ چپ رہوں تو چٹکیاں بھرتے ہیں۔ تو پھر آپ ہی فرمایئے۔"

" کیا فرماؤں "؟

" کہ میں کیا کروں ؟"

"ایک خاص گر بتاؤں مگر کسی کو بتانا نہیں۔"

"فرمایئے۔"

"بس روٹھ جاؤ"

وہ مسکرا دی

ایک دفعہ وہ میرے ساتھ بحث میں الجھ گئی۔ اگر میں کسی قسم کی اپنی فوقیت بتاتا تو وہ بھی اس کا جواز پیش کرتی۔ میں نے سوچا ان نکتوں کی طرف چلو جدھر اس کا گزر نہ ہو۔ اتنے میں اس کی نظریں جرابوں اور پینٹ کی درمیانی ننگی جگہ پر اٹک گئیں۔ کہنے لگی۔

"بال کدھر گئے وہ تو اچھے لگتے تھے"

میں نے سوچا جانے اس کا ذہن کدھر گھوم جائے کیوں نہ صاف صاف بات بتا دوں۔ میں نے اسے سمجھایا کہ مالش کرنا ہو تو بال توڑ ہو جاتا ہے۔ اور زیادہ ورزش کے لیے مالش از حد ضروری ہوتی ہے۔ اور میں جب بھی ورزش کروں زیادہ ورزش کرتا ہوں۔ تھوڑی ورزش سے میرا کچھ نہیں بنتا۔

فٹ سے کہنے لگی۔ "میرے بھیا بھی بڑی ورزش کرتے ہیں"

مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے کہا۔

"تم بھی کیا کرو"

بڑی سنجیدگی سے کہنے لگی

"میں میلوں سائیکل چلا لیتی ہوں۔ آپ کے آنے سے پہلے سائیکل

پر بارہ میل گھوم کر آئی تھی"

"شاباش۔ بڑی بہادر لڑکی ہو تم"

"آپ میرا مذاق اڑاتے ہیں"

وہ مجھ سے پھر رُوٹھ گئی۔ مجھے غصہ آگیا۔ میں نے تنگ آکر کہا۔

"تم کبھی تو سیدھی رہا کرو۔ ہر وقت روٹھنا۔ بالکل بچّوں والی عادت ہے تمہاری۔"

"تو آپ نہ ستایا کریں"

میں نے ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے کہا

"مجھ سے ڈرا کرو۔ میرا غصہ بہت بُرا ہے۔ میں الٹا پیدا ہوا تھا"

جلدی سے بولی

"میں بھی الٹی پیدا ہوئی تھی"

میرا ہنسی کے مارے بُرا حال ہوگیا۔ میں نے کہا۔

"بھئی واقعی تم میری بھی گرو ہو۔ چلو آؤ اب صلح کرلیں۔" اور وہ فوراً من گئی۔

البتہ مجھے یہ جرمانہ دینا پڑا کہ اس نے میری گھڑی اتار لی۔ اور میں چپکے سے بیٹھا دیکھا کیا۔ مجھے پتہ تھا اگر میں نے اسے کہا کہ میرے کام کی چیز ہے تو فوراً ناراض ہو جائے گی اور پھر مجھے منانے کے لیے کوئی اسکیم بنانا پڑے گی۔

وہ تھی بھی چھوٹے سائز کی۔ اگرچہ وہ مجھے پسند تھی۔ لیکن میں نے

دل ہی دل میں نئی خریدنے کا ارادہ کرلیا۔ میں نے خود ہی گھڑی اس کی کلائی پر باندھ دی۔ اور تعریف کرنے لگا۔

" واہ بھئی تمہاری کلائی پر تو خوب سجی ہے "

اس نے مجھے ٹیڑھی نظروں سے دیکھا۔ مجھے نظر آرہا تھا کہ اب وہ میری اس بات کو طنز سمجھ کر ناراض ہو جائے گی۔ اس لیے میں نے جانے کے لیے پہلو بدلا۔ اس نے مجھ پر عجیب سی نگاہ ڈالی "

" آپ جا رہے ہیں "

" ہاں۔ تم جو لڑتی رہتی ہو میرے ساتھ "

" پھر کب آئیں گے "

" جب تم نہ لڑنے کا عزم کرلو گی "

" اچھا میں نہیں لڑوں گی۔ آپ کل آجائیں " وہ مسکرانے لگی۔

" بہت اچھا "

ع سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

میں نے اس کی ناک کھینچی اور سیڑھیوں میں بھاگ گیا۔

O

ریوالور پینٹ کی جیب میں ہونے کی وجہ سے بیٹھنے میں مجھے کچھ دقت محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اسے نکال کر میز پر رکھ دیا۔

ملیتا نے ریوالور کی طرف دیکھا اور پھر حیران ہو کر میری طرف دیکھا۔ میں

نے وضاحت کردی ۔ اس نے خود ہی ایک روز پریشان سی ہو کر کہا تھا کہ کہیں کچھ لوگ آپ کا پیچھا نہ کریں ۔ اس دن مجھے بیٹھے بیٹھے کافی اندھیرا ہو گیا تھا۔ اس کا خیال تھا لوگ شک کرتے ہیں۔ اور مجھے اس نے ہنستے ہوئے پوچھا تھا اگر ایسا ہو جائے تو آپ کیا کریں گے ۔ میں نے اس کا جواب میز پر رکھ دیا تھا ۔

وہ بھی سب کچھ سمجھ چکی تھی۔ مگر جانے اس نے نیا رُخ کیوں اختیار کر لیا۔ اداس سی ہو کر کہنے لگی ۔

" آپ نے قاتل فلم دیکھی ہے ۔"

" نہیں ، تم نے دیکھی ہے ؟ "

" ہاں "

" اکیلے ہی اکیلے دیکھ آتی ہو "

" میں کوئی پکچر نہیں چھوڑتی "

" بڑا نیک کام کرتی ہو "

" آج بھی قاتل فلم دیکھیں "

" دکھا دو گی، تو دیکھ لیں گے "

" نہیں آپ خود دیکھ آئیں "

" تم ساتھ چلو "

" نہیں "

" نہ سہی "

" نہ سہی "

نہ سہی تو اس نے جلدی سے میری ضد میں کہہ دیا تھا اور وہ رو دینے ہی والی تھی کہ اسے اپنے پیش کیے ہوئے موضوع کا احساس ہو گیا۔ پھر کہنے لگی

" آپ ضرور یہ فلم دیکھیں "

" میرے پاس تو پیسے نہیں "

" پیسے مجھ سے لے لیں "

" میں اکیلا نہیں دیکھ سکتا "

" اپنے کسی دوست کو ساتھ لے جائیں "

" اُس کے بھی پیسے دو گی "

" ہاں "

" کرایہ کے بھی "

" ہاں "

" چائے کے بھی "

" نہیں "

" نہ سہی "

" نہ سہی "

لیکن وہ چاہتی تھی کہ میں یہ فلم ضرور دیکھوں اس لیے وہ سارے پیسے دینے کو تیار ہو گئی۔ میں نے بھی آمادگی کا اظہار کیا۔ میں نے روپے لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا تو اُس نے پھر ہاتھ کھینچ لیا۔

" آپ نے فلم ولم کچھ نہیں دیکھنا ایسے ہی میرے روپے ضائع کریں گے "

"تمہارے اپنے دل میں چور ہے۔ تم چاہتی ہی نہیں ہو کہ میں وہ فلم دیکھوں۔ اچھا یہ تو بتاؤ اس فلم میں ہے کیا۔ کیا کوئی قتل ہو جاتا ہے!"

"نہیں بچ جاتی ہے"

"کون بچ جاتی ہے؟"

"ہیروئن"

"پھر میرا اس فلم سے کیا تعلق ہے"

"میں چاہتی ہوں آپ ضرور وہ فلم دیکھیں"

"ایسی کنجوس ہو روپے دیتی بھی نہیں ہو اور یہ بھی کہتی ہو کہ فلم دیکھوں۔ تمہیں ایسا ہی شوق ہے تو ساتھ چل کر دکھا دو۔"

"ساتھ نہیں جاؤں گی"

"تمہیں کھا تو نہیں جاؤنگا"

"امی ناراض ہوں گی"

"لیکن تمہیں یہ خیال کیوں سوجھا"

"کبھی کبھی مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آپ مجھے چھوڑ کر کہیں چلے جائیں گے۔ یا مجھے جان سے مار دیں گے۔"

"پاگل تو نہیں ہو گئیں"

وہ چپ ہو گئی۔ وہ واقعی اداس سی لگ رہی تھی۔ میں نے اسے گلے سے لگا لیا۔ اس کی پیشانی پر ایک بوسہ دیا۔ اسے یقین دلایا کہ تم مجھے جان سے زیادہ عزیز ہو۔ اور اس نے میرے پیچھے جذبات کی گرمی سے اندازہ لگا لیا کہ

میں نے جو کچھ کہا ہے اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہے۔

ہم پھر باتیں کرنے لگے۔ ہمارے سامنے اتنے موضوع آئے کہ ہم اس بات کو بالکل بھول گئے۔ گھوم پھر کر ہم شادی کے موضوع تک آ گئے تھے۔ شاید اس میں کچھ ہاتھ بینا کا بھی ہو۔ بہرحال اب میں بھی دلچسپی لے رہا تھا۔ میں نے کہا۔ " بینو ہماری شادی کی بڑی پیاری تصویریں دیکھی اور دوسرے اہم پرچوں میں چھپیں گی۔ اخبار خبریں چھاپیں گے۔" کہنے لگی۔

" یوں کیسے بدنامی ہوگی "

مجھے اس کی یہ بات بری سی لگی۔ میں نے فہمائش کے انداز میں اسے ذرا سا روکا۔ وہ ہنسنے لگی۔

" آپ تو یوں کہہ رہے ہیں جیسے سچ مچ شادی ہو رہی ہے "

میں نے کہا۔ آخر تو ایک دن ہونا ہی ہے۔ تم بری باتیں نہ کیا کرو۔ بغیر سوچے خوشی پر لات مار دیتی ہو۔ اس سے طبیعت مکدر ہو جاتی ہے۔ ہمارے کرنے کی اور کتنی اچھی اچھی باتیں ہیں۔" اسے اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا اور اب وہ اپنی خفت کو مٹانے کے لیے ہنسے جا رہی تھی۔

وہ حسب سابق خاص اہتمام اور ایک خاص انداز سے میک اپ سے کیے اور اعلیٰ قسم کا جدید ڈیزائن کا فراک پہنے بیٹھی تھی۔ اب ہم اتنے بے تکلف ہو چکے تھے کہ جذبات بھڑک اٹھتے تو بلا جھجک اپنی ہر خواہش کا احترام کر لیتے۔ اور یہ روز ہی ہوتا تھا۔

ہم پر کچھ ایسی ہی خود فراموشی کی سی کیفیت تھی کہ اس نے کہا۔

"آپ سیدھے طریقے سے شادی کیوں نہیں کر لیتے"

میں نے اپنے آپ کو شادی کے لیے بالکل تیار کر لیا تھا۔ مگر تکنیکی مشکلات کے علاوہ ایک اہم مسئلہ یہ تھا کہ بڑے بھیا کی شادی ہونے والی تھی۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ بھیا کی شادی کے بعد باجی کا نمبر ہے۔ پھر میری باری آئے گی۔ میں کیسے کہہ سکتا ہوں کہ بڑے بھائی سے پہلے میری شادی کر دی جائے۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ کوئی بھائی بہن کی راہ میں چٹان بن کر کھڑا ہو سکتا ہے"

میرا خیال تھا مینا میری مجبوریوں سے بڑی متاثر ہوئی ہو گی۔ اور اب میرے ساتھ اس کا رویہ ہمدردانہ ہو گا۔ مگر میری اس ساری تقریر کے بعد مینا پر ذرا بھی اثر نہ ہوا تھا

وہ تو خود غرض تھی، چکنا گھڑا، میں نے اور سنجیدہ ہو کر کہا۔

"میری بات پر ایک لمحہ ہی کے لیے غور کر لیا کرو"

"میں کیا کروں۔ میں بھی مجبور ہوں"

"تمہیں کیا مجبوری ہے؟"

"بس ہے"

اس کا جواب بڑا نامکمل اور بڑا بے تکا سا ہوتا تھا۔ میں ناراض ہو کر وہاں سے اٹھ آیا۔

○

مینا اور نوید دونوں ڈرامہ دیکھنے کے لیے تیار کھڑی تھیں۔ میرے آنے پر

اس نے نوید کو ڈراما دیکھنے بھیج دیا۔ خود رُک گئی۔ ہم دونوں اکیلے رہ گئے۔

اس کے حسن کی چاندنی فضا کو منور کر رہی تھی۔ مجھ پر سحر زدہ سی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ اس کے حسن اور اس پر خاص اہتمام نے میرے اندر بجھی ہوئی چنگاری کو سلگا دیا تھا۔ اس کی پُر خلوص توجہ نے میرے خون میں حدت پیدا کر دی تھی۔ میں نے اسے پُرجوش پیار سے دیکھا اس نے میرا ہاتھ اپنے دل کی دھڑکن پر رکھ دیا۔

اس کے غازے اور سُرخی کی بھینی بھینی مہک مجھے بدمست کر رہی تھی میں نے اس کے ہونٹوں پر سُرخی کی تہہ کو دیکھا۔ کتنی پیاری تھی اس کی نرمی اور چمک۔ میرے ہونٹ یاقوتی ہونٹوں کے اور قریب ہو گئے۔ وہ مسکرا دی۔

"آپ ہالی وڈ کی فلمیں دیکھا کرتے ہیں"

"کبھی کبھی"

"یہ سب کچھ آپ وہیں سے سیکھتے ہیں"

اُسے کچھ یقین سا ہو گیا تھا کہ میں نے آج تک اپنی پوری زندگی میں کبھی کسی لڑکی کو نہیں چھوا۔ اس لحاظ سے وہ اپنے آپ کو پہلی خوش قسمت لڑکی سمجھتی تھی جو میری زندگی میں سب سے پہلے داخل ہوئی۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ اس نے میرے متعلق اب تک جو کچھ سُنا تھا سب بکواس تھی۔ اسلیئے اس نے مجھے مکمل طور اپنا لیا تھا۔ شاید اسی لیے وہ آج خود سپردگی کی حالت میں تھی۔

اس نے پرس کا منہ کھول کر ہونٹوں پر سُرخی کی نئی تہہ جمائی اور چھوٹے

سے آئینہ میں ان کو دیکھنے لگی۔ میں نے اسے کہا۔

" اس تکلف کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے تو ویسے ہی تم بے حد خوبصورت لگتی ہو۔ سادگی حسن کی انتہا ہے۔"

اس نے بڑی ہی پیاری ساڑھی پہن رکھی تھی۔ ساڑھی کا پلّو بار بار شانے سے کھسکنے کی وجہ سے اس کا جگمگاتا جمپر بار بار ننگا ہو جاتا تھا۔ اس کے سینے کا زیر و بم میرے احساسات کو جلا رہا تھا۔ وہ میری طرف پیار سے دیکھتی اور میرے بدن پر کبھی کہیں کبھی کہیں چٹکی بھر دیتی۔ میں ابھی سنبھلنے بھی نہ پاتا کہ وہ ایک اور چٹکی بھر دیتی۔ میں سٹپٹا کر پرے ہٹ جاتا۔

اس نے پرس سے سینٹ کی چھوٹی سی شیشی نکالی۔ پہلے اپنے رومال پر چند قطرے گرائے پھر انہیں جمپر پر مل دیا۔ میرے کوٹ پر بھی وہی رومال پھیر دیا۔ دل کے قریب اس کے ہاتھ رک گئے۔

" کتنی تیز دھڑکن ہے "

" تم تو پھر بھی اس دھڑکن کی آواز نہیں سنتی ہو "

میری سانس کا لمس وہ اپنے ہونٹوں پر محسوس کر رہی تھی۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

" خراب ہو جائیں گے "

" نہیں ہوتے۔ ہٹا دو یہ ہاتھ۔ کیا تمہاری یہ سرخی میرے جذبات سے بھی زیادہ قیمتی ہے ؟ "

" نوید کے ہونٹ اسی طرح خراب ہوئے ہیں۔"

میں چونکا۔ وہ شاید میری حیرانی کو سمجھ گئی تھی۔ کہنے لگی۔
"ہر وقت چوستی رہتی تھی۔ کتنے موٹے ہو گئے ہیں اس کے ہونٹ"
یہ حقیقت ہے کہ میری سمجھ میں اس کی بات نہیں آئی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے میں نے سوچا بھی، لیکن پھر میں اپنے جذبات کی تیزی میں بہہ گیا۔ میں نے اس کا ہاتھ پرے ہٹا دیا اور اپنا ایک ہاتھ اس کے سر کی پشت پر عین کنڈلی کے اوپر رکھ دیا۔ اس نے میرے ہاتھ سے اپنا سر الگ کر لیا۔
"آپ چھوڑ دیں۔ میں خود ہی ——"
اس سے پہلے کہ وہ بات پوری کرتی میرے ہونٹوں نے اس کے خوبصورت ہونٹوں پر مہر لگا دی تھی۔ ہم کتنی ہی دیر مدہوش سے رہے۔
کبھی میں نے سوچا تھا میں مینا کے قریب کبھی نہ جاؤنگا۔ اسے صرف آنکھوں سے پیار کیا کروں گا۔ نظروں نظروں میں اسے پوجا کرونگا۔ اسے اپنے دل کی رانی بناؤنگا۔ وہ سنگار کیے میرے احساسات پر حکمرانی کیا کرے گی۔ میرے لیے وہ مقدس دیوی ہو گی۔ میں اس کا ادنیٰ سا پجاری ہوں گا۔ یہی میری زندگی ہو گی۔ یہی میرا اصل مدعا ہو گا۔ اور اس کے لیے میں دل ہی دل میں اخلاقی ضابطے بھی تیار کر رکھے تھے۔
جانے کس وقت اور کیسے انجانے میں میرے یہ اصول فنا ہو گئے تھے۔ ضابطے بھپ کر کے اڑ گئے تھے۔ حسن کی نرم ملائم چاندنی جذبات کی گرم دھوپ ماند پڑ گئی تھی۔ جذبات کی آگ تڑپتے ہوئے شعلے بن گئی تھی۔ اپنی تمام لغزشوں کے باوجود مجھے یہ احساس تھا کہ وہ ایک سندر کلی ہے۔ اس کی جبین

مہک ہی اس کا حُسن ہے اگر میں نے اسے چھولیا تو وہ ایک پھول بن جائے گی۔ پھول اگرچہ بڑی خوبصورت چیز ہے۔ لیکن اس کی زندگی بڑی مختصر سی ہے۔ ذراسی بہار دکھانے کے بعد وہ مرجھا جاتا ہے اور اس کی پتیاں بکھر جاتی ہیں۔ بگولے آتے ہیں اور یہ پتیاں کہیں دُور پھینک دیتے ہیں۔ بینا کو میں ان بگولوں کے حوالے نہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ تو میری زندگی، میری روح تھی۔

میں نے اسے گلے لگا لیا۔

"کیا ہوا" وہ حیران تھی۔

"کچھ نہیں ایسے ہی ایک خیال آگیا تھا"

"آپ کا رنگ زرد ہوگیا ہے۔"

"نہیں تو" میں نے محسوس کرلیا تھا کہ اس خیال سے چونکنے کے بعد میری پہلی سی سرخی عود کر آئی ہے۔

وہ میرے ساتھ اور جھپٹ کر بیٹھ گئی تھی۔ میں نے اس کی سیاہ آنکھوں کی گہرائیوں میں جھانکا۔ وہاں پیار کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ میں اُن کی گہرائیوں میں ڈوب گیا۔

میں اس کی طرف بڑے پیار سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ میری آنکھوں پر رکھ دیا۔

"ایسی نظروں سے نہ دیکھا کریں"

"کیوں"

"میرا دل قابو میں نہیں رہتا۔"

"میں کیا کروں بیتنا، میری نظریں قابو میں نہیں رہتیں" میں اُمنڈتے ہوئے جذبات سے بے قابو ہُوا جا رہا تھا۔ وہ کہنے لگی

"میں آپ کو اپنے دل کی ایک بات بتاؤں"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کہنے لگی۔ "آپ کی آنکھیں بڑی پیاری ہیں مستی بھری ہے ان آنکھوں میں۔ میں تو مدہوش سی ہو جاتی ہوں۔ کتنی حسین آنکھیں ہیں۔ کاش میری بھی ایسی ہی آنکھیں ہوتیں۔"

"تمہاری آنکھیں تو بے حد خوبصورت ہیں۔"

"یہ تو آپ کو لگتی ہیں۔"

میں نے اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں جھانکا۔ پیار کی وسعت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ میں نے اُن آنکھوں کو چوم لیا۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اسے آہستہ آہستہ دباتی رہی۔ میں سحر زدہ سا محسوس کر رہا تھا۔ میرے خون کی حدت بڑھ رہی تھی۔ میری تیز تیز سانسوں کا لمس وہ اپنے ہونٹوں پر محسوس کر رہی تھی۔ اس نے میرا ہاتھ ایک مرتبہ پھر چوما اور اسے اپنے دل کی دھڑکن پر رکھ دیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ میرے دل کی دھڑکن بھی کافی تیز ہو چکی تھی۔ میں نے اسے اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ وہ میری گود میں رس بھرے پکے ہوئے میٹھے پھل کی طرح آ گری تھی۔

میں نے اس کی تیز تیز سانسوں کو ایسے محسوس کیا جیسے میں خواب میں ہوں۔ مجھے اس کے چہرے پر ایک سرخی سی نظر آئی۔ وہ مدہوش سی تھی اور میں حسن کے نشے میں دیوانہ بن چکا تھا۔ چند لمحوں بعد اس کے چہرے پر زردی

سی چھا گئی تھی۔ اور اس کی سانسیں معمول پر آ گئیں تھیں۔ میرا یہ سنہرا خواب چکنا چور ہو چکا تھا۔

سحر زدہ کیفیت بھپ سے اڑ گئی تھی...... طوفان گزر چکا تھا...... میں سنبھل گیا.... مگر یہ طوفان اتنے زور کا آیا تھا کہ وہ اپنے ساتھ سب کچھ بہا کر لے گیا تھا۔

نبد کلی مہکتا ہوا پھول بن گیا تھا۔ اس پھول کی مہک ابھی تک میرے دل پر چھائی ہوئی تھی۔ مگر میں غمزدہ سا ہو گیا تھا۔ مجھے پتہ تھا یہ مہک عارضی ہے۔ شاید وہ اب بے رنگ و بو پھول بن جائے گی۔ اس کے بعد ویرانے ہوں گے اور وحشت ہو گی۔ میں اس خیال سے کانپ گیا۔ میں اس پھول کی نکھری پتیاں بگولوں کے حوالے نہ کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس مہکتے پھول کو سینے کے ساتھ چمٹا لیا۔

میرا دل پھر زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

---

(۵)

میرے دل میں طوفان امڈ رہا تھا۔
میرے احساسات جاگ اٹھے تھے۔ میرا ذہن بُری طرح بے چین تھا۔ میں نے اپنے شیش محل کو خود ہی چکنا چور کر دیا تھا۔ محبت کی قوسِ قزح پر میں نے خود ہی سیاہی پھیر دی تھی۔ میرا دل اپنی آگ میں آپ ہی جل رہا تھا۔ مجھے یہ پچھتاوا تباہ کر رہا تھا۔ وہاں سے واپسی کے بعد میں ابھی گھر میں نہیں پہنچا تھا۔ سارا راستہ مجھے بے چینی نے سکون سے کچھ بھی تو نہ سوچنے دیا تھا۔ پوسٹ آفس کے سامنے میرے قدم خود بخود رک گئے۔ میں نے بنیتا کو صرف اتنا لکھا:-

میرے دل کی چاندنی
طوفان گزرنے کے بعد پشیمانی فضول ہے۔
مگر مجھے صدمہ پہنچا ہے۔

کیا تم مجھے معاف کرسکوگی ؟
کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم اور میں ہم دونوں اس خلش کو بھول جانے کی کوشش کریں ۔ ——————— تمہارا اپنا
" ویپک "

خط پوسٹ کرنے کے بعد کسی قدر بے چینی میں کمی تو ہو گئی ۔ میرا جی چاہا ابھی واپس جا کر تفصیل سے معذرت چاہوں ۔ اندھیرا چھا رہا تھا اور اس وقت ملاقات میں ضرور دشواری پیش آتا تھی ۔ پھر مجھے جواب کا انتظار کرنا تھا ۔
انسان جذبات کی رو میں بہہ کر کیا کچھ نہیں کر گزرتا ۔ انسان کی فطرت کی تعمیر ہی کچھ اس طور ہوئی ہے کہ وہ کتنے بھی کلیے بناتا ہے ۔ انسانی جبلت کو بدل نہیں سکتا ۔ لغزش ہو کے رہتی ہے ۔ کتنا بھی سنبھل سنبھل کر چلے ، کسی وقت پھسل ہی جاتا ہے ۔ ہم دونوں سے بھی یہی ہوا ۔ کم از کم میں تو اس اقدام سے ہمیشہ سے گریز کرتا آرہا تھا ۔ اور میں شادی سے پہلے اسے مکمل عورت نہیں بنانا چاہتا تھا ۔ مگر شاید وہ لمحہ اس کے بدن کی نئی پکار تھی جس نے نہ مجھے سنبھلنے دیا اور نہ خود وہ ہی سنبھل سکی ۔ کتنی ہی دیر اس کے جسم کی حسین چاندنی جذبات کے گھرے سائے کے نیچے پھیلی رہی تھی ۔ اس کے لبوں کا رس میری پیاسی زبان چوستی رہی ۔ اس کے سینے کا زیر و بم میرے دل کی دھڑکنوں میں مدغم ہوتا رہا ۔ اس کی گداز بانہیں میرے گلے کا ہار بنی رہیں ۔ روز ایسا ہی ہوتا تھا اور ہمارے قدم کبھی نہیں لڑکھڑائے تھے ۔ خود ہی ایک حد سی مقرر ہو گئی تھی ۔ شاید دو دلوں میں چپکے ہی چپکے کوئی معاہدہ ہو چکا تھا ۔ ہلکی ہلکی پیار

کی آگ دلوں میں دہکتی رہتی تھی۔ ہم اس نشے میں مخمور بیٹھے رہتے تھے۔ یہ تپش یہ آگ کبھی بالکل مدھم ہو جاتی تھی۔ کبھی ذرا چمک اٹھتی تھی اور جب کوئی چھوٹا سا شعلہ بھی سر اٹھانے لگتا تو ہم دانستہ ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے تھے۔ احساس جلتے رہتے مگر بدن کی آگ آہستہ آہستہ ٹھنڈی پڑ جاتی۔ لیکن اس وقت تو چھوٹے چھوٹے شعلے مل کر آتش فشاں بن گیا تھا۔ ہم دونوں آگ میں جلنے لگے تھے۔ اور جب آگ بجھی تھی بیٹا جو کچھ دیر پہلے دہکتا ہوا کوئلہ تھی جل کر راکھ ہو گئی تھی۔ میں نے اسے سینے سے لگا لیا کہیں یہ راکھ تیز ہوا میں بکھر نہ جائے۔ مجھے اس کی دوشیزگی سے پیار تھا اور وہی میرے ہاتھوں فنا ہو گئی تھی۔ میں بے حد رنجیدہ تھا۔ اس لیے میں نے اسے معذرت کا خط لکھا تھا۔

○

کتنے ہی دنوں تک مجھے کوئی خط نہ ملا تو میں پریشان سا رہنے لگا۔ میں نے اسے خط بھی لکھا تھا لیکن اس کا جواب ہی نہ آیا تھا۔ شاید وہ مجھ سے ناراض ہو گئی تھی۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس تھا۔ اس لیے میں طبعاً ضد کرنا چاہتے ہوئے بھی اسے ملنے کے لیے چلا گیا۔

وہ بیٹھی کوئی خط لکھ رہی تھی۔ مجھے ایک دھچکا سا لگا۔ کتنی معمولی سی بات تھی مگر اس نے میرے دل پر گہرا گھاؤ ڈال دیا۔ اس کے چند الفاظ نہ لکھنے کی وجہ سے اتنے دن میں کس قدر پریشان رہا تھا اور اسے

اس بات کا احساس تک نہ تھا۔ میرا دل خون ہو گیا۔ میں نے نفرت سے اس کی طرف دیکھا لیکن وہ مجھے دیکھ کر مسکرا دی۔

"بیٹھیے" وہ ہنسنے لگی

"نہیں" میرا دل شق ہو گیا تھا۔

اتنے دنوں کے بعد آئے ہیں اور آتے ہی لڑائی۔ وہ پھر ہنسنے لگی۔ میری مسکراہٹیں جانے کون چھین کر لے گیا تھا۔ مجھے ہنسی آ ہی رہی تھی میں بے حد سنجیدہ ہو گیا تھا۔ کرختگی میرے چہرے پر مجسم ہو گئی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"توبہ اتنا غصہ۔ مجھے مارنا چاہتے ہیں لیجئے ماریئے۔"

"مجھے کیا ضرورت ہے۔"

"تو پھر ناراض کیوں ہیں"

"تم نے خط کیوں نہیں لکھا۔"

"میں کیا کرتی مجھے فرصت ہی نہیں ملی"

"کیوں کوئی خاص مصروفیت تھی۔"

"اور الزام لگا لیجیے"

"مجھے کیا ضرورت ہے جو جی میں آئے کرتی رہو۔"

"آپ تو اس وقت بالکل بیگانے لگ رہے ہیں۔"

"یہاں اپنا ہے ہی کون۔ یہ بھی بھلا کوئی بات ہے فرصت نہیں ملی۔ کیا مصروفیت تھی تمہیں۔ خط تو انسان اٹھتے بیٹھتے، راہ چلتے، ہر جگہ

لکھ سکتا ہے۔ تمہیں کون سے ایسے کام آپڑے تھے "

"آپ بیٹھیں تو"

"اور لوگوں کو خط لکھنے کی تمہیں فرصت مل جاتی ہے" مجھ سے آخر نہ ہی رہا گیا۔

کہنے لگی۔ "یہ تو ایک سہیلی کو لکھ رہی تھی پڑھ لیجیے۔"

"مجھے کیا ضرورت ہے"

"اچھا ایک دفعہ بیٹھ تو جائیں"

"میں نہیں بیٹھونگا۔"

اس نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور میری طرف دیکھ دیکھ کر ہنستی رہی۔ میں کافی جلی کٹی سنا چکا تھا۔ میرا غصہ آہستہ آہستہ اترنے لگا تھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر ہنستی رہی۔ اور ہنستے ہنستے اس نے پوچھا۔

"آج گھر میں لڑ کر آئے ہیں"

تمہیں تو بس مذاق سوجھ رہا ہے۔ تم اندازہ بھی نہیں کر سکتی ہو کہ میں کس قدر پریشان رہا ہوں۔

"اچھا آیئے صلح کرلیں۔ اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے اس کا ہاتھ زور سے دبا دیا تو وہ سی کر کے رہ گئی۔ میں نے طنز سے پوچھا :- "بڑی تکلیف ہوئی ہو گی ؟"

"ہاں"

"میں یہی تمہیں بتانا چاہتا تھا کہ تکلیف کیا چیز ہے"

"شکریہ"

"تم بھی درد کی لذّت سے آشنا ہو جاؤ۔"

"شکریہ۔ آپ تو اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے مار دینا چاہتے ہوں۔"

"ہاں مار دینا چاہتا ہوں"

"تو مار دیجیے سب دکھوں سے نجات مل جائے گی۔"

"بڑے دُکھ ہیں تمہیں" میں نے طنز سے پوچھا

وہ سنجیدہ ہو گئی۔

"میرے دُکھ کا آپ کو کیا پتہ ہے"

"جی میں تو بچہ ہوں۔ مجھے کیا سمجھ ہے۔ میرے لہجہ میں حقارت اور طنز تھی۔

وہ خاموش ہو گئی۔ میں بھی خاموش بیٹھا رہا۔ کتنا ہی وقت اسی طرح گزر گیا۔ وہ کبھی کبھی کنکھیوں سے میری طرف دیکھ لیتی تھی۔ میں بھی کسی وقت اچٹتی سی نگاہ اس پر ڈال لیتا تھا۔ نہ اسے کوئی بات سوجھ رہی تھی۔ نہ ہی میں کوئی نیا موضوع پیش کرنا چاہتا تھا۔ میں باتوں کے موڈ میں بھی نہ تھا۔ مجھے اس کی یہ حرکت بھولتی ہی نہ تھی کہ وہ بیٹھی کسی کو خط لکھ رہی تھی۔ اور میں کتنے ہی دن اس کے خط کے لیے پریشان رہا تھا۔ میرے احساس میں شدّت لمحہ بہ لمحہ اور نمایاں ہو رہی تھی۔ میں اٹھنے لگا تو اس نے کہا

"بیٹھیے"

میں نے غم و غصّہ سے اس کی طرف دیکھا اور اٹھ بیٹھا۔

"آپ جا رہے ہیں۔" اس نے منہ لٹکا کر پوچھا

"ہاں" میں نے غصّہ اور رنج سے جواب دیا۔

"پھر آپ کب آئیں گے"

مجھے اس کی اس بات پر اور بھی غصہ آیا۔ جیسے وہ خود ہی چاہتی ہو کہ میں چلا جاؤں۔ میں نے قہر آلود نظروں سے اسے دیکھا اور کہا۔

"پتہ نہیں"

وہ میرا منہ تکتی رہی اور میں رنج اور غصّہ سے مضطرب طبیعت پر ایک بھاری بوجھ لیے زمین پر زور زور سے پاؤں مارتا وہاں سے آ گیا۔

○

مجھے اس سے نفرت سی ہو رہی تھی۔ پھر بھی میں اس کے خط کے لیے مضطرب تھا۔

پچھلے چند دنوں سے مجھے اس کا کوئی خط نہیں ملا تھا اور میرے دل میں وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔ کبھی کبھی تو یہ وسوسے یقین میں بدل جاتے تھے کہ وہ مجھ سے بے وفائی کر رہی ہے۔ ایسے لمحات میں مجھے عتیق یاد آنے لگتی۔ میری محبّت کا عتیق جو زمانہ مجھ سے چھین کر لے گیا تھا۔ جانے کیوں مجھے ابھی تک اس سے محبّت تھی۔ مجھے تو ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ محبّت ابدی ہو۔ محض واقعات کے رد و بدل اور ناسازگار حالات

کیونکہ سے یہ جذبہ وقتی طور پر دب گیا ہو۔ اس کی محبت کی جڑیں اتنی مضبوط تھیں کہ میری رگ رگ میں سرایت کر گئی تھیں۔ میں دیر تک عتیق کے متعلق سوچتا رہا۔

اسی رات میں نے ایک خواب دیکھا۔ میرا چھوٹا بھائی امریکہ جانے والا تھا۔ میں نے اسی خوشی میں اس سے مٹھائی کا مطالبہ کیا۔ اس کے پاس ایک جاپانی تصویر تھی۔ اس نے شرط پیش کی کہ اس کے ٹکڑے جوڑ کر تصویر مکمل کیجئے پھر مٹھائی کھلاؤں گا۔ میں نے ابھی آدھی تصویر مکمل کی تھی کہ اس نے مجھے مٹھائی پیش کر دی۔ میں مٹھائی کھانے لگا تو میری نظر شاہراہ کی طرف گئی۔ میں نے اور آگے جھانکا تو عتیق سڑک پر کھجور کے درخت کے نیچے اپنے چھوٹے بھائی اور ایک بچے کی انگلی پکڑے تھی۔ میں مٹھائی چھوڑ کر جلدی سے اس کی طرف بڑھ گیا۔ اور تھوڑے سے فاصلہ پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ یہ شہر کی نواحی بستی تھی۔ میں نے سڑک پر کھڑے ہو کر اپنی رہائش گاہ کی طرف دیکھا جو صرف سو دو سو گز کے فاصلے پر تھی۔ وہاں سے مجھے کوئی بھی نہ دیکھ رہا تھا۔ میری نظر خود بخود عتیق کی طرف اٹھ گئی۔ وہ سڑک کے کنارے استادہ کھجور کے درخت کے نیچے بیٹھ گئی تھی۔ شاید تھک گئی ہو۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر اس نے جلدی سے برقعے کی نقاب گرا دی۔ میرا رنگ اڑ گیا۔ مجھے اس پر غصہ آنے لگا۔ اتنی بے وفا۔ وہ تو بے وفا لڑکیوں میں سے نہیں تھی۔ پھر جانے اسے کیا ہو گیا تھا۔ میرا غصہ شعلوں کی طرح بھڑکنے لگا۔ اگر یہ اسقدر بے وفا نہ ہوتی تو آج میں زندگی کے ویرانوں میں اکیلا

نہ رہ جاتا۔ آج میں اس قدر پریشان نہ ہوتا۔ لیکن اسے تو احساس بھی نہیں تھا کہ میرے ہاتھوں کوئی اس قدر تباہ حال ہوگیا ہے۔ میرے آنسو خود بخود رخساروں پر بہنے لگے۔ میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے رخساروں پر ہاتھ پھیر کر دیکھا تو وہ سچ مچ گیلے تھے۔

میں اس گندے خواب کے متعلق زیادہ سوچنا نہ چاہتا تھا۔ میں نے عتیق کو بھول جانا چاہا۔ مجھے اس سے بحد محبت تھی مگر میں اسے بھول جانا چاہتا تھا یہی ایک صورت میری عافیت کی تھی۔ اسی سے میں اپنی زندگی کو ویران کھنڈر ہونے سے بچا سکتا تھا۔ میں ان ویرانوں میں اب بہاروں کا منتظر تھا۔ مگر بہار کتنی عارضی چیز ہے۔ ذرا دیر کے لیے زندگی میں آتی ہے۔ پھر وہی اداسی چھا جاتی ہے۔ مجھے مینا یاد آنے لگی۔ وہ میرے لیے بہار بن کر آئی تھی مگر اب تو زندگی پہلے سے بھی زیادہ خاردار بن گئی تھی۔

میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ میں مینا کو کبھی خط نہیں لکھوں گا۔ اسے ملنے بھی نہیں جاؤں گا۔ جب اسے میرا احساس ہی نہیں تو پھر میں کیوں اس کے لیے دیوانہ بنا رہوں۔ کئی روز اسی طرح گزر گئے۔ اگرچہ نفرت کا جذبہ ابھرتا رہا۔ لیکن پھر بھی اس کے خط کا مجھے متواتر انتظار رہتا۔ ایک دن میں نے پوسٹ مین کے قدموں کی آواز سنی تو میرا دل دھڑکنے لگا۔ وہ ضرور مینا کا خط لے کر آیا تھا۔ پتہ نہیں یہ کیا بات تھی۔ جب بھی وہ اس کا خط لاتا تھا تو میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہی اس کے قدموں کی چاپ سے اندازہ لگا لیتا تھا کہ وہ ضرور مینا کا خط لایا ہے۔ اس کے پاؤں کی چاپ یہ سارا مضمون

مجھے بتا دیتی تھی۔ اور اب تک جب بھی میں نے ایسا سوچا تھا میرا اندازہ صحیح نکلا تھا۔ میں اس کے ٹھہرنے سے پہلے ہی دروازے تک پہنچ جاتا تھا۔ اس دن تو میں کافی بے تاب تھا۔ میں بھاگ کر دروازے تک گیا۔ اس نے مجھے خط دیا تو میں نے ہینڈ رائیٹنگ سے اندازہ لگا لیا کہ یہ خط بیناہی کا ہے۔ مگر میں نے اسے وہاں کھڑے کھڑے کھولنے کی جسارت نہیں کی۔ میں اپنے کمرے میں صوفے پر آ گیا اور انتظار کرنے لگا کہ دل کی دھڑکن ذرا کم ہو لے تو اسے کھولوں۔ چند لمحوں میں میں سنبھل گیا۔ میں نے اسے چاک کر کے ایک کاغذ نکالا۔ اور اسے پڑھنے کی کوشش کی مگر نفس مضمون میری سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ کاغذ پر عجیب سی ٹیڑھی میڑھی سطور پھیلی ہوئی تھیں۔ میں نے پریشان ہو کر انہیں سمجھنے کی کوشش کی لیکن میں ان کا ربط قائم نہ کر سکا۔ یہ عجیب گورکھ دھندہ سوچنے لگا۔ چند منٹوں کے بعد میں نے اسے پھر کھولا اور غور کرنے لگا۔ پھر اچانک اس کی شکل جیسے میرے ذہن میں آ گئی۔ وہ دیپک کی شکل بنتی تھی۔ میں نے غور سے دیکھا۔ تحریر میں بھی لفظ دیپک لکھا تھا۔ یہ دوہری لکیریں تھیں اور لکیروں کے اندر جو جگہ خالی بچ گئی تھی اس میں باریک الفاظ میں خط لکھا گیا تھا۔

خط میں سوائے گلے شکوؤں کے اور کچھ بھی نہ تھا۔ مجھے پڑھ کر سخت طیش آیا۔ میں نے اسے بند کر کے جیب میں ڈال لیا اور کتنے ہی دن اسے جواب تک نہ لکھا۔

چند دنوں کے بعد مجھے اس کا ایک اور خط ملا جس میں اس نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا تھا اور خط کے اختتام پر ایک شعر لکھا تھا ؂

ہماری بے بسی یہ ہے کہ ہم کچھ کہہ نہیں سکتے
وفا بدنام ہوتی ہے اگر فریاد کرتے ہیں

میں اس شعر کے متعلق سوچنے لگا۔ یہ شعر پہلے کبھی میری نظر سے نہیں گزرا تھا۔ اچھے اچھے شاعروں کے پانچ دس دیوان تو میرے پاس بھی پڑے تھے۔ ان میں سے تو کسی کا بھی یہ شعر نہیں تھا۔ غالباً کوئی فلمی گانا ہوگا۔

میرے ذہن میں عجیب قسم کے خیالات گڈمڈ ہو رہے تھے۔ کبھی تو اسے میں بناوٹ سمجھتا۔ کبھی مجھے یقین آنے لگتا کہ وہ جذباتی ہے اور میرے ساتھ اس کا رویہ مخلصانہ ہے۔ پھر میری محبت کی تہہ میں ایک نفرت سی کیوں پنپنے لگی تھی۔ میں عجیب الجھن میں پھنسا ہوا تھا۔ میں کتنی ہی دیر سوچتا رہا کہ میں اس کے ساتھ محبت کروں یا نفرت کرنے لگوں۔ مجھے اس کی بعض باتیں بے حد چبھنے لگی تھیں۔ پھر اس پر پیار بھی آجاتا تھا۔ چند دن یہی کیفیت مجھ پر طاری رہی۔ لیکن میں کسی نتیجہ پر بھی نہ پہنچ سکا۔ اس کا ایک اور خط مجھے ملا۔ جس میں اس نے صرف ایک دفعہ ملنے کی التجا کی تھی۔ میں اس وقت غصہ میں بیٹھا تھا۔ میں نے اس کا خط پڑھتے ہی اسے مختصر سا جواب دیا۔ جس میں لکھا کہ تمہارا عجیب غریب رویہ میری سمجھ میں تو آتا نہیں۔ کبھی تم شعلہ بن جاتی ہو تو کبھی شبنم۔ کیوں نہیں اپنے دل کے ساتھ فیصلہ کر کے کوئی ایک راہ اختیار کر لیتی۔ میرا دل جلا ہوا ہے۔ اور میں اس کے سوا تمہیں کچھ نہیں کہنا چاہتا ہے

یہ بھی رہے خیال ستانے کے ساتھ ساتھ
ہم بھی بدل رہے ہیں زمانے کے ساتھ ساتھ

اس کا جواب فوراً دے دیا گیا۔ غالباً وہ خط پڑھتے کے بعد ایک لمحہ بھی صبر نہ کر سکتی تھی۔ اس نے اپنے خط میں مجھے خوب جلی کٹی سنائیں۔ خط پڑھ کر میں تو بگولے کی طرح اُٹھا اور اندھا دھند کار کو ڈرائیو کرتا اس تک جا پہنچا۔ میرے تیور چڑھے ہوئے دیکھ کر وہ ہنسنے لگی۔

"بڑے غصہ میں ہیں ؟"

"ہاں"

"بس میں نے ایک دفعہ چند لفظ کہہ دیئے تو دل جل گیا۔ آپ نے ہزار ہا بار مجھے کیا کیا نہیں کہا ہے۔ میرا ہی حوصلہ ہے۔"

"میں کچھ نہیں سننا چاہتا"

"تو پھر زہر کیوں نہیں دے دیتے"

"میں تمھیں روکتا ہوں۔ کھا لو۔ ابھی کھا لو"

"آپ اپنے ہاتھ سے کیوں نہیں کھلا دیتے"

"مجھے بھی مجرم بنانا چاہتی ہو۔ اگر میں زندہ رہ جاؤں تو تمہارا کیا حرج ہے"

"آپ میرے ساتھ ہی گھسٹتے جائیں تو اس میں قباحت بھی کیا ہے!"

مجھے انتہائی غصہ کے باوجود اس کی بات پر ہنسی آگئی۔ اتنے میں نوید داخل ہوئی تو مینا اسے کہنے لگی۔

"یہ تمہارے کلاس فیلو مجھ سے روٹھے ہوئے ہیں۔ صلح کرا دو۔ شاید تمہارا کہا مان جائیں" نوید میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔ لیکن میرے چہرے پر سنجیدگی کچھ اس طرح مسلط ہو گئی تھی کہ مجھے ہنسی ہی نہ آ رہی تھی۔ نوید نے

مجھے غور سے دیکھا اور کہنے لگی۔

"نا بابا ہم آپ کی بات میں نہیں آتے۔ تم جانو اور یہ جانیں۔ ان کا کیا پتہ ابھی تمہارے ساتھ میری بھی خاطر کر دیں۔"

مجھے ہنسی آ گئی۔ لیکن میں دوسرے لمحہ ہی پھر سنجیدہ ہو گیا۔ غصہ تھا کہ ٹھاٹھیں مارتا بڑھتا آ رہا تھا۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ وہ روز یوں مجھے پشیمان کیوں کر دیتی ہے۔ آخر وہ مجھ سے چاہتی کیا ہے۔ جب اسے پتہ ہے کہ میں بے حد حساس آدمی ہوں پھر وہ ایسی بات کیوں کرتی ہے جس سے میرا دل جلنے لگتا ہے۔ اگر وہ مجھے چھوڑنا ہی چاہتی ہے تو ایک ہی دفعہ کیوں نہیں چھوڑ دیتی۔ یہ کیا طریقہ ہے کہ مجھے مضطرب حالت میں چھوڑ دیتی ہے۔ میں تڑپتا رہتا ہوں۔ اور خود ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح سکون اختیار کر لیتی ہے۔ میں ابھی انہی سوچوں میں گم تھا کہ اس نے میری کلائی پکڑ کر میری نئی سوچوں میں گم تھا کہ اس نے میری کلائی پکڑ کر میری نئی گھڑی اتار لی۔ میں خاموش بیٹھا رہا۔ اس نے پہلا سٹریپ اتار کر نیا سٹریپ اسے لگا دیا اور گھڑی پھر میری کلائی پر باندھ دی۔

"میں نے صرف اسی لیے آپ کو بلایا تھا۔"

"بس"

"ہاں بس" وہ بھی سنجیدہ ہو گئی۔

"یہ سٹریپ تم وہاں بھی بھیج سکتی تھیں"

"میں صرف آپ کو یہ بتانا چاہتی تھی کہ آپ کا ذوق اچھا نہیں۔"

"اور تمہارا ذوق تو بہت اچھا ہے"

"کیوں؟"

"وہ شعر کہاں سے اڑایا تھا تم نے ———— خیر چھوڑو۔

"اور کیا کیا بتانا چاہتی ہو؟

"بتانا تو بہت کچھ چاہتی ہوں (اس نے لمبی آہ بھری) لیکن آپ سے ڈر لگتا ہے۔"

"میں کوئی درندہ تو نہیں"

"یہی میں بھی سوچتی ہوں۔ پھر جانے آپ سے ڈر کیوں لگتا ہے"

"تمہارے دل میں کوئی چور ہو گا"

"میرے پاس دل ہی نہیں تو چور کیسا؟" وہ ہنسنے لگی..... دل تو ایک چور لے گیا تھا۔"

"کیا تم اپنی عادتیں نہیں بدل سکتی ہو؟ اب مجھے چور بھی بنا دیا"

"سر تسلیم خم ہے"

"میں تمہیں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں"

"میں کیا کروں"

"اگر میرے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہتی ہو تو جو راہ میں دکھاؤں اس پر چلا کرو۔ تم مجھے بہت پریشان کرتی ہو۔"

"مگر کوئی بات بھی تو ہو"

"تمہارے لیے تو کوئی بات ہی نہیں لیکن میرا تختہ ہو جاتا ہے۔"

"اب نہیں کروں گی"

"کیا نہیں کرو گی"

"جو آپ کہیں گے وہ نہیں کروں گی"

"یعنی الٹ چلو گی" مجھے ہنسی آ گئی۔ وہ بھی ہنسنے لگی۔ میں نے اسے پھر کہا۔

"تم میری بات مانو گی یا نہیں؟"

"مانوں گی"

"وعدہ"

"پکا وعدہ" اس نے ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے اس کے ہاتھ کو زور سے دبا دیا اور وہ ایک خاص ادا کے ساتھ سی کر کے رہ گئی۔

O

مچلتے ارمانوں اور دھڑکتے دل کی تہہ میں ایک خدشہ سا کروٹیں لینے لگا تھا۔ مجھے محبت کے اندھے جذبہ پر بھروسہ نہیں رہا تھا۔

اس کا التفات بڑھتا ہی جاتا تھا اور میرے سامنے سوچوں کی وسعتیں تھیں۔

یہ پتہ نہیں کیا بات تھی کہ میں ابھی تک اس مبہم نفرت کو جو میرے دل میں گھر کر چکی تھی سمجھ ہی نہ سکا تھا۔ وہ پیار کی تہہ میں بھی جوان ہو رہی تھی۔ کبھی تو میں بیٹھا بیٹھا اس سے اتنی نفرت کرنے لگتا کہ دو اور دو چار کی طرح میں اس

کے متعلق قطعی فیصلہ کر لیا۔ اور اسے چھوڑ دینے کے لیے آخری خط کا مضمون سوچنے لگتا۔ پھر اسے ایک دفعہ مل لینے کو جی چاہتا اور جب وہ مجھے ملتی تو میں اپنی سوچی ہوئی ہر بات بھول جاتا۔ وہ مجھے اتنے پیار سے ملتی کہ میں اسے دل سے اپنا بنا لیتا۔

میں نے اڑتی سی ایک خبر سُنی تھی کہ وہ کچھ اچھی لڑکی نہیں ہے اور اسے کئی قسم کے لوگ ملنے آتے رہتے ہیں۔ میرے دل میں کچھ جلن سی پیدا ہوئی لیکن جب میں نے ٹھنڈے دل سے اس پر غور کیا تو میرے سامنے کچھ وجوہات تھیں۔ ان میں سے دو خاصی وزن دار معلوم ہوتی تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ ماڈرن ٹائپ کی نئے رنگ میں رنگی ہوئی لڑکی تھی۔ ایسی زندگی عام لوگوں میں ویسے ہی مشکوک سمجھی جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کا پیشہ ہی ایسا تھا کہ ہر قسم کے لوگوں سے واسطہ رہتا تھا۔ مجھے یہ الزام کچھ بھونڈا سا لگا۔ شاید مقتضائے محبت بھی یہی ہو۔

جب میں شادی کے لیے اپنے آپ کو بالکل تیار پاتا تو مجھے اس کے بوسیدہ مکان کا خیال آتا۔ کیا مجھے اتنے خستہ حال مکان میں اپنے دوستوں کے ساتھ آنا ہوگا۔ میرے دوست کیا خیال کریں گے۔ میرا جی چاہا کہ میں بینا کی توجہ اس پہلو کی طرف مبذول کراؤں مگر یہ بات میں ہمیشہ بھول جاتا رہا۔

دو ایک مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ اس کی خوبصورتی پر مجھے گہن کا گمان ہوا۔ جانے کیوں یہ خیال میرے دل میں کروٹیں لینے لگتا کہ دنیا میں خوبصورت ترین لڑکیاں ہیں اور میں کہاں آ پھنسا ہوں۔ میں اس جال سے نکلنے کی

کوشش کرنے لگتا۔ شادی کا مطلب ہے عمر بھر کا ساتھ۔ شادی سے پہلے ہی میرے دل میں اس طرح کا احساس پیدا ہو رہا تھا۔ جانے بعد میں یہی احساس کیا صورت اختیار کرلے۔ میں اس خیال سے کچھ خوفزدہ سا رہنے لگا تھا۔ ایک دن میں نے مینا سے کہہ ہی دیا۔

"تم یہ ہسپتال بند کر دو"

"کیوں؟"

"مجھے تمہارا لوگوں سے اس طرح ملنا پسند نہیں۔"

"گزارہ کیسے ہوگا"

"جائیداد جو ہے"

"میں اکیلی تو مالک نہیں۔ آپ دے دیا کریں۔"

"پھر چھوڑ دو گی"

"ہاں"

"کتنے میں تمہارا گزارہ ہو جائے گا"

"ایک ہزار ماہوار"

"بس"

"یہ لو پہلی قسط" میں نے سو سو کے دس نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

"آج سے یہ دروازہ بند ہو جانا چاہیئے"

"تو آپ کیسے ملیں گے یہی تو ایک راہ ہے۔"

میں خاموش بیٹھا رہا۔ وہ بھی چپ سی ہو گئی۔ ہم دونوں کوئی بات

نہ کر رہے تھے مگر اکٹھے بیٹھے ہوئے تھے۔ بڑی دیر کے بعد وہ آہستہ سے بولی:۔

"اب شادی ہو جانی چاہیئے"

"میں کوشش کر رہا ہوں" میں پھر خاموش ہو گیا۔ اُس نے میری طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔

"شادی کے بعد بھی میں یہیں رہونگی، اسی مکان میں"

"کیوں"

"میں امی کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔ مجھے امّی سے بڑی محبت ہے۔"

تو تم پھر امّی کے ساتھ ہی رہنا ———— "

اس نے میری بات کاٹ دی

"پھر تو میں دو ہزار ماہوار لیا کروں گی۔ امّی کے بھی تو اخراجات ہونگے۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"آپ پہلے کیا کہنے لگے تھے"

"میں جناب کے سامنے یہ عرض کرنے والا تھا کہ آپ امی کو بھی میرے غریب خانہ پر لے آئیں جو خدمت ہو سکی کرتا رہونگا۔"

یہاں ہی رہتے میں کیا حرج ہے"

"چلو یہ بھی سہی۔ تم یہاں رہنا۔ میں وہاں ایک اور بیوی رکھ لوں گا۔ کبھی کبھی تمہارے پاس آجایا کروں گا۔ خرچ باقاعدہ دیتا رہوں گا"

"مجھے آپ سے پہلے ہی یہی اُمید تھی۔ اسی لیے آپ کہتے رہتے ہیں مجھ پر اعتماد نہیں کرتی ہو۔ یہ لیجئے کاغذ اور اس پر لکھ دیجئے۔"

"کیا لکھ دوں ؟"

"یہی کہ آپ ساری زندگی دوسری شادی نہیں کریں گے۔ میں پچاس ہزار حق مہر لکھواؤنگی"

اور فرمایئے "

"معاہدہ تحریر میں ہونا چاہیے۔ میں عبارت لکھواتی ہوں۔ آپ لکھنا شروع کریں۔"

وہ مجھے عبارت لکھواتی رہی اور میں مسکرا مسکرا کر لکھتا رہا۔ جب نفس مضمون پورا ہو گیا تو میں نے طنز سے کہا۔

"بس اور لکھوالو"

اس نے کاغذ تہہ کر کے اپنے پرس میں رکھ لیا اور مسکرا کر کہنے لگی۔

"شکریہ"

مجھے اس کی یہ ادا اتنی خوبصورت لگی کہ میں نے اسے اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ اس نے بھی اپنا سب کچھ میرے سپرد کر دیا اور ہم دونوں خوابوں کے حسین جزیروں میں کھو گئے۔ میں نے پاؤں کی بے حد مدھم چاپ سنی تو میں نے اسے کہا :-

"شاید کوئی آیا ہے۔"

وہ مجھ سے الگ ہو گئی۔ اتنے میں اس کی امی کی آواز آئی۔

"کون ہے ؟"

"امی دیپک ہیں"

کبھی کبھی پہلے بھی ایسا اتفاق ہوا کرتا تھا۔ بیناؔ میرا نام اُن کو بتاتی۔ پھر میں بیناؔ سے کہتا، کہو سلام عرض کرتے ہیں۔ وہ میرا سلام اُن تک پہنچاتی تو اس کی امی دعائیں دیتی واپس مڑ جاتی۔ میں اپنے خطوط میں بھی اُن کو سلام لکھنا نہ بھولا کرتا تھا۔ بیناؔ مجھے چڑانے کے لیے میری امیؔ کو سلام لکھا کرتی۔ حالانکہ وہ خوب جانتی تھی کہ یہ سلام وہاں تک نہیں پہنچے گا۔ اسے معلوم تھا کہ میں نے ابھی تک، بیناؔ کے متعلق اپنی امی کو کچھ نہیں بتایا۔ پھر بھی وہ سلام ضرور لکھا کرتی تھی۔ اس کے پاس یہ ایک ایسا تیر تھا جسے چلانا وہ کبھی نہ بھولتی تھی۔

آج بیناؔ کی امیؔ کے تیور بگڑے ہوئے تھے۔ اس نے کہا۔

"یہ کوئی شریف آدمیوں کا طریقہ ہے"

ہم دونوں نے خوف کے مارے دم سادھ لیے۔ یہاں تک بات رہتی تو میں برداشت کر لیتا۔ لیکن اُن کا پارہ چڑھتا ہی چلا گیا۔

"یہ لڑکا اپنے گھر والوں کو کیوں نہیں کہتا۔ اس طرح آکر تنہا بیٹھنا کوئی شرافت ہے۔ اس نے سمجھ کیا رکھا ہے۔ ہم کوئی کنجر ہیں۔ چل اُٹھ تو بیناؔ۔ آ میرے ساتھ اندر چل"

بیناؔ نے اپنی امی کو کہا۔

امی آپ جائیں میں ابھی آتی ہوں"

اس کی امی اسے اٹھانے پر مصر رہی اور وہ اپنی امی کو منع کرتی رہی۔ اندر آنے کے لیے کہتی رہی۔ اس کی امی واپس مڑی تو بیناؔ نے میری طرف

دیکھا۔ میرا رنگ جو پیلا پڑ چکا تھا۔ اب غصّہ سے سُرخ ہو رہا تھا۔ میرا غصّہ آتش فشاں پہاڑ کے لاوے کی طرح اُبلنے لگا۔ میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بیناؔ نے گھبرا کر میری طرف دیکھا اور پھر ہاتھ سے مجھے روکنا چاہا مگر میں نے اس کے ہاتھ کو جھٹکے سے پرے کر دیا۔ وہ دونوں بازو پھیلا کر دروازے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

" آپ مجھے تنہا چھوڑ جائیں گے "

میں خاموش رہا اور آگے بڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر دروازے کی دونوں سائیڈوں کو گرفت میں لے لیا۔

" میں آپ کو اس طرح نہیں جانے دوں گی۔ "

" تم میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ "

" نہیں "

" اس میں میرا کیا قصور ہے "

" مجھے نہیں پتہ "

میں نے اس کے ایک ہاتھ کو زور سے جھٹکا دیا اور تیزی سے سیڑھیاں اتر گیا۔ میں غصّہ سے تقریباً پاگل ہو رہا تھا۔

(۶)

میرا دل پھٹا جا رہا تھا !

مجھ میں ایک نیا احساس جاگ رہا تھا اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ یہ حادثہ اچانک نہیں ہوا تھا بلکہ یہ ایک سوچی سمجھی اور بڑی گہری سازش تھی جس میں بینا اس کی امی اور شاید نوید بھی شامل تھی ۔ پچھلی ملاقاتوں میں بینا سرراہے اس قسم کی گفتگو مجھ سے کہا کرتی تھی ۔ وہ کہتی :۔

اگر امی آپ کو کچھ کہہ دیں تو "

میں مصنوعی انداز میں بگڑ کر کہتا

" پھر میں چلا جاؤں گا "

" ہمیشہ کے لیے "

" ہاں "

" آپ میرے لیے اتنی سی بات بھی برداشت نہیں کر سکتے "

"یہ تو میرے وقار پر حملہ ہے" میں ہنسنے لگتا۔

"مجھے آپ سے یہی امید ہے" وہ روٹھ سی جاتی۔

وہ پہلے ہی سے اس قسم کا منصوبہ بنا رہی تھی اور یہ محض اس لیے ملتوی ہو رہا تھا کہ اسے شک تھا کہ واقعی میں اسے چھوڑ کر نہ چلا جاؤں اور پھر کبھی واپس ہی نہ آؤں۔ اب ہمارے تعلقات اتنے بڑھ گئے تھے کہ اسے اس قسم کی توقع نہیں رہی تھی۔ وہ شادی کے لیے کہہ کہہ کر تھک چکی تھی اور اب یہی ایک راستہ تھا کہ وہ امی سے کہلوائے۔ مگر یہ صورت نازک ہو گئی۔ اور سچ مچ ہم دونوں کے لیے پریشانی کا باعث بن گئی۔

میرا خیال تھا بینا مجھے ضرور خط لکھے گی اور معذرت بھی چاہے گی مگر میرے اس طرح چلے آنے سے شاید اس کی خودی پر بھی ضرب لگی تھی۔ میری یہ امید قطعی غلط ثابت ہوئی۔ وہ تو شاید قسم کھائے بیٹھی تھی۔ یا شاید سچ مچ مجھ سے ناامید ہو گئی تھی۔ مجھے بھی اپنی بے عزتی کا سخت قلق تھا۔ میں نے بھی خط نہ لکھا۔ لیکن انتظار بھی تھا کہ شاید اب بھی وہ معذرت چاہنے لگے۔ اسی انتظار میں دن گزرے، ہفتے بیتے، مہینے ختم ہوئے مگر یہ سلسلہ دونوں طرف سے بند ہی رہا۔ میں تو اس سے کچھ مایوس بھی ہو گیا۔ اس نے ایک دفعہ ذکر کیا تھا کہ ایک لڑکا ہے۔ امی کا خیال اس کے لیے ہو رہا ہے۔ میں نے سوچا شاید وہیں یہ کوئی بات ہو گئی ہو۔ ہو سکتا ہے اس نے کسی نئی دوستی کا رشتہ استوار کر لیا ہو۔ بہرحال میں نے اسے بھول جانے کی کوشش کی۔

یہ عجیب بات تھی کہ مجھ میں ایک نیا جذبہ پیدا ہو رہا تھا۔ میں اسے زندگی کا ایک عام واقعہ سمجھ کر بھول جانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کی محبت میرے دل میں چودھویں کا چاند بن کر چمکنے لگی تھی۔ وہی صورت جس سے مجھے کبھی کبھی نفرت سی ہو جاتی تھی اب مجھے نہایت پیاری لگنے لگی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ پہلے وہ اتنی پیاری مجھے کبھی نہیں لگی تھی۔ شاید یہ انسانی کمزوری ہے کہ جب قربت ہوتی ہے تو اس کی قدر کچھ ماند پڑ جاتی ہے۔ لیکن جب دوری ہو جائے تو وہی عام چیز دل کے لیے چاند بن جاتی ہے۔ اس جذبہ کے باوجود میں اسے بھول جانا چاہتا تھا۔ مجھے اپنی بے عزتی کا اب بھی شدت سے احساس تھا۔

مجھے ایک بات بے حد مضطرب کر دیتی تھی۔ وہ یہ کہ میں نے اس کے ساتھ دل کی گہرائیوں سے وعدہ کیا تھا کہ میں اسے کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ تا زندگی ساتھ دوں گا۔ جب مجھے اپنے یہ الفاظ یاد آتے تو میں بڑا پشیمان ہوتا۔ میں اپنے وعدے سے پھرنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ احساس اب اور بھی شدت اختیار کر رہا تھا۔ شاید اس کی تہہ میں جذبۂ الفت بھی ہو۔ میں بار بار یہی سوچتا کہ وہ مجھے عام لڑکا ہی سمجھے گی۔ میں ان لڑکوں جیسا نہیں بننا چاہتا تھا جو محبت کرتے ہیں تو آسمان سے ستارے توڑ لانے کے وعدے کرتے ہیں اور جب اُن کا دل بھر جاتا ہے تو ہوا کی طرح غائب ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہم دونوں میں صلح کرانے والا کوئی نہیں تھا۔ اور ہم دونوں اپنی اپنی جگہ اڑے ہوئے تھے۔ صرف اس کی ذرا سی ایک تحریر ہمارا ملاپ کرا سکتی تھی۔

میں نے اس سے ملے بغیر دل ہی دل میں اب اپنے آپ کو شادی کے لیے بھی تیار کر لیا تھا۔ شادی کے اس آخری مرحلہ سے پہلے نہ جانے مجھے تحقیق کی کیوں ضرورت محسوس ہوئی۔ میرا ایک ایڈووکیٹ دوست تھا وہ ان کی گلی کے ساتھ ہی دوسری گلی میں رہتا تھا۔ مجھے اچانک چوک میں مل گیا۔ تو میں نے بے ساختہ اس سے پوچھ لیا۔

"یار ان لڑکیوں کے متعلق ذرا پتہ تو کر دو۔"

"کیوں کیا بات ہے"

"میرا ایک دوست ہے اس کا شادی کا سلسلہ یہاں ہو رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کیوں نا پہلے تفصیلات معلوم کر لی جائیں۔ تم تو آسانی سے یہ کام کر سکتے ہو۔"

"ہاں کر سکتا ہوں لیکن پہلے آپ ٹھیک ٹھیک بات بتائیں۔"

میں مسکرانے لگا۔

"ٹھیک کہہ رہا ہوں بھئی"

"یہ بات ہے تو میں پتہ نہیں کرونگا۔"

وہ بات کو سمجھ گیا تھا۔ میں نے بھی بات کو چھپانا قرین مصلحت نہ سمجھا۔ میں نے سارا راز اسے بتا دیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ آپ ان کے متعلق کیا کچھ جاننا چاہتے ہیں۔ میں نے دو تین باتوں کا ذکر کیا۔ ایک تو یہ کہ وہ کس کریکٹر کے لوگ ہیں۔ دوسرے ان کی جائیداد کتنی ہے۔ تیسرے یہ کہ تعلیم کہاں تک ہے۔ اس نے میرے ساتھ وعدہ کیا اور

چلا گیا۔

جب وہ مجھے دوبارہ ملا اس نے تفصیلات بتانا شروع کیں۔ میں چڑ کے یہ چیز کے برداشت کرتا رہا۔ میرا رنگ فق ہو گیا۔ لیکن میں بے جان سا اس کے پاس کھڑا رہا اور تفصیلات سننے کے لیے اپنی تمام قوتیں مجتمع کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ میرے دل کو اتنے دھچکے لگے کہ اس کے بات ختم کرتے ہی میں گھر آکر لیٹ گیا۔ میرا دل سچ مچ پھٹ گیا تھا۔

میں حیران تھا اس نے مجھے اس قدر اندھیرے میں کیوں رکھا۔ اس کی ہر بات جھوٹ ہوا کرتی تھی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے پاس ڈگری ڈگری کچھ بھی نہیں تھی۔ صرف وہ ڈاکٹر کے نام سے مشہور تھی۔ مینا نے مجھے کہا تھا کہ نوید اور وہ دو ہی بہنیں ہیں اور وہی ساری جائداد کی مالک ہیں۔ جتنی جائیداد کا اس نے ذکر کیا تھا اصل میں ان کی حیثیت اس کا عشرِ عشیر بھی نہ تھی۔ وہ دو بہنیں نہیں تھیں بلکہ پانچ چھ تھیں اور وہی مکان ان کا اپنا تھا جس میں وہ خود رہتی تھیں۔ اور وہ بھی گروی تھا۔ محبت میں انسان اندھا ہو جاتا ہے۔ وہ دور کی بات سوچ ہی نہیں سکتا۔ بات تو معمولی سی تھی۔ میں ذرا سا بھی غور کرتا تو ایک ایسا نقطہ میرے ذہن میں آجاتا کہ مجھے مزید کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہ محسوس ہوتی۔ اگر وہ اتنی امیر کبیر ہوتی جیسا کہ وہ ذکر کیا کرتی تھی تو یہ معمولی سا ہسپتال جو گھر کے ایک کمرے پر مشتمل تھا چلانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہاں بھی تقریباً اسے فراغت رہتی تھی۔ سب سے بڑی خبر میرے لیے یہ تھی کہ اس کا کریکٹر مشکوک بتایا

گیا تھا۔ کئی قسم کے لوگ اس سے ملنے آتے رہتے ہیں۔ زیادہ تفصیل میں جانے سے مجھے یہ پتہ چلا کہ وہ پیشہ ور رنڈیوں کی طرح تو نہیں ہیں البتہ وہ نئے نئے امیر آدمیوں سے تعلقات استوار کرتی رہتی ہیں۔ اُن کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ مال ہتھیا لیا جائے۔ جب مال ختم تو دوستی بھی ختم۔ حتیٰ الوسع ان کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ اپنے جسم کو بچایا جائے۔

"وہ صرف جسم کی نمائش پر اکتفا کرتی ہیں اور اس میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہیں۔"

یہ الفاظ میرے ایڈوکیٹ دوست کے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ کبھی یہ کوشش ناکام بھی ہو جاتی ہے۔ آخر آگ کا کھیل ہے۔ کوئی کہاں تک بچ سکتا ہے۔"

میں نے یہ سب کچھ نہایت صبر اور تحمل سے سُنا تھا اور اب میرا دل اور دماغ دونوں پھٹے جا رہے تھے۔

چند دن مجھ پر یہی کیفیت رہی، میں دیوانگی کی حالت میں رہا۔ نفرت کی طوفانی لہریں آئیں اور چلی گئیں۔ اس نفرت کے باوجود بھی ایک الفت سی ضرور تھی۔ اور میری دلی خواہش تھی کہ جو کچھ میں نے سنا ہے خدا کرے سب جھوٹ ہو۔ شاید یہی الفت میری کمزوری تھی۔ اس کا ہر جھوٹ برداشت کیا جا سکتا تھا مگر کریکٹر والی بات واقعی ناقابلِ برداشت تھی۔ میں پورا پورا دن ہر گھڑی سوچوں میں ڈوبا رہتا۔ راتیں بڑی بے چین ہوتیں۔ دیواریں مجھے سوگوار نظر آتیں۔ زندگی کا ویرانہ وسیع تر ہوتا رہتا۔ میری اضطرابی حالت مجھے کسی بھی نتیجہ پر نہ پہنچنے دیتی تھی۔ میری نظر پھر پچھلے واقعات کی طرف گھوم

جاتی۔ اس کے تریا چلتر۔ اس کی چالبازیاں، اس کی شاطرانہ چالیں۔ سب میری نظروں کے سامنے گھومنے لگتیں۔ محبت میں میں کس قدر بیوقوف بن گیا تھا۔ اس دن جب اس نے زہر کی شیشی پکڑی تھی اور اس کے متعلق جو کچھ اس کے منہ سے نکلا تھا وہی اس بات کی دلیل تھی کہ وہ ڈاکٹری نہیں جانتی۔ مجھے اپنے حال پر ہنسی آنے لگی۔ میں اپنے آپ کو محبت کی نفسیات کا ماہر سمجھتا تھا مگر میں ایک معمولی لڑکی کے عشووں سے کسی قدر فریب کھاتا رہا تھا۔ عقلمند سے عقلمند آدمی عورت کے لیے کوئی چیز ہی نہیں۔ وہ بڑا دانا بنتا ہے۔ ناصح بنتا ہے۔ شیخ بنتا ہے۔ لیکن جب خود پھنس جاتا ہے تو پھنس کھا جاتا ہے۔ وہ ناصح صرف دوسروں کے لیے ہوتا ہے۔

میں دل ہی دل میں بل کھاتا رہا۔ کبھی مجھے محبت کے وہ سنہری لمحے بھی یاد آتے جو بڑے ہی حسین تھے۔ میں سوچتا مجھے اس کی جائیداد سے تو شادی نہیں کرنا تھی۔ اگر میرے حالات نہ بدلتے تو میری پوزیشن بھی اس سے کچھ مختلف نہ ہوتی۔ اس میں جو زیادہ تکلیف دہ بات تھی وہ یہ تھی کہ اس نے میرے ساتھ فریب کیوں کیا۔ اگر وہ سچ کہہ دیتی تو میری نظر میں اس کی وقعت اور بھی بڑھ جاتی۔

مجھے ایک حل سوجھا تھا۔ میں کبیدہ خاطر کچھ پریشان سا اس کے پاس پہنچا۔ وہ بالکل وہی پہلی مینا تھی، چند مہینے پہلے والی مینا۔ مجھے دیکھ کر کچھ حیران سی ہوئی۔

"آپ آج کیسے آ گئے" اس نے بالکل ایسے کہا جیسے میں کوئی بھولا ہوا

یاد ہوں۔ میں نے کہا۔

" بس یونہی آ گیا ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ کا زیادہ وقت نہیں لونگا۔ میرے بیٹھنے سے آپ کو زحمت تو ہوگی۔ پھر بھی میں ایک استفسار چاہتا ہوں۔ آپ زیادہ بُرا تو نہیں منائیں گی؟"

" جی فرمایئے" اس نے بالکل لاتعلقی سے کہا۔

" بینا میں چاہتا ہوں ہم دونوں اچھے طریقے سے الگ ہو جائیں۔ ہم دونوں پڑھے لکھے ہیں اگر ایک دوسرے پر کیچڑ نہ بھی اچھالیں پھر بھی تو مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔"

" میں کچھ سمجھی نہیں"

" میرا خیال ہے تمہیں زیادہ سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں۔ ایک تو یہ کہ تمہیں سب کچھ معلوم ہی ہے۔ دوسرے یہ کہ میں خواہ مخواہ تمہارا دل بُرا کرنا نہیں چاہتا۔ جب ہم نے ایک دوسرے کو ملنا ہی نہیں تو پھر کوئی ایسا موضوع چھیڑا جائے جس سے خواہ مخواہ ہم میں سے کسی ایک تکلیف پہنچے یا ناگوار محسوس ہو۔"

" میں آپ کی بات ابھی تک نہیں سمجھی"

" میرا خیال ہے تم نہ ہی سمجھو تو اچھا ہے"

" آپ صاف صاف کیوں نہیں کہتے۔"

" میرے لیے اب تم ایک اجنبی لڑکی ہو۔ میں چاہتا ہوں تم وہ تحریریں مجھے دے دو جو وقتاً فوقتاً مجھ سے لکھواتی رہی ہو۔ وہ خطوط بھی جو

یں تمہیں لکھتا رہا ہوں ۔ میں بھی تمہاری تمام تحریریں واپس دینے پر آمادہ ہوں ۔"

" میں تو نہیں دوں گی "

" میرا خیال ہے تم نے جواب دینے میں ذرا جلدی سے کام لیا ہے ۔ کیا تم اس پر دوبارہ غور کرنا پسند کرو گی ۔"

" آپ ایسا کیوں چاہتے ہیں "

" کیا تم خود اس کی وجہ نہیں جانتی ہو ۔"

" نہیں "

" میرا خیال ہے تم جانتی ہو مگر چھپانے کی کوشش کر رہی ہو آخر اس سے فائدہ کیا ہوگا ۔ ہمیں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہیے ۔ مجھے جلدی بھی ہے ۔ پھر میں تمہارا قیمتی وقت خراب بھی نہیں کرنا چاہتا ۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم اس گندی بحث میں پڑیں ہی نہ "

" لیکن میں آپ سے وجہ پوچھنا چاہتی ہوں تم نے اور میں نے کچھ وقت اچھا گزارہ ہے اس لیے میں نہیں چاہتا کہ میں وہ الفاظ تمہارے منہ پر کہہ دوں جو میں نے خود انتہائی کربناک حالت میں سنے ہیں ۔"

اس کا رنگ زرد پڑ گیا لیکن اس نے کہا ۔

" پھر بھی آپ کہہ دیں ۔"

" یقیناً تم مجھے اس کے لیے مجبور نہ کرو ۔ میں تمہاری وقعت کم از کم تمہاری نظروں میں گھٹانا نہیں چاہتا ۔"

"آپ کہہ دیں۔ میں پہلے بھی بہت کچھ سنتی آئی ہوں۔ میں ان باتوں کی عادی سی ہوگئی ہوں۔ مجھے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ ممکن ہے وہ تمام الزامات غلط ثابت ہوں۔"

"میرا خیال ہے الزام کو ثابت کرنا خاصہ مشکل ہوتا ہے۔ یہ تو خود انسان میں اخلاقی جرأت ہونی چاہیئے کہ وہ اپنی بدعنوانیوں کو تسلیم کرلے!"

"میں کوشش کروں گی"

"میرے لیے یہ انتہائی خوشی کی بات ہوگی۔ کیسا بھی سنگین گناہ ہو اگر وہ میرے سامنے سچ سچ کہہ دیا جائے تو میرے دل میں ذرا سا میل بھی نہیں آتا جبکہ اس کے برعکس میرے سامنے ذرا سا بھی جھوٹ کہہ دیا جائے تو میرا خون کھولنے لگتا ہے۔ میرے کردار میں یہ ایک ایسی کمزوری ہے جس تریاق میرے پاس بھی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے تم میرے جذبات کا احترام کروگی۔ میں تمھیں اچھے لمحات کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ میرے سامنے کسی بات کو چھپانے کی کوشش نہ کرنا۔"

"اب آپ کہہ ہی دیں"

"میں نے سنا ہے" میں ایک لمحہ کے لیے ٹھہر گیا۔ میں ایسے الفاظ کی تلاش میں تھا جو اتنے کھلے ہوئے بھی نہ ہوں اور مطلب کی وضاحت بھی ہو جائے۔ میں تہذیب کے دائرے سے باہر نکلنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے پھر کہنا شروع کیا:۔

"تمہارے پاس کچھ ایسے لوگ آتے ہیں جن کا آنا میں پسند نہیں کرتا۔

میں نے سنا ہے وہ اچھی نظر سے نہیں آتے" میں ابھی کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ اس نے میری ادھوری بات کو ختم کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کو میرے کریکٹر پر شک ہے۔" وہ بالکل بجھ سی گئی۔

"اب میں تمہیں کیا بتاؤں، میرے سننے میں تو یہی آیا ہے" اس کا رنگ بالکل زرد ہو گیا۔

"آپ کو یقین ہے" اس نے سر جھکائے ڈوبی ہوئی آواز سے کہا۔

میں نے کہا۔ "تم میرے یقین کو کیا کہتی ہو۔ تم اپنی بات کرو"

"لوگ تو بکواس کرتے ہیں" اس کا رنگ سرخ ہو گیا تھا۔

"ہو سکتا ہے تمہاری بات سچ ہو۔ میں اپنی بات پر زور اس لیے نہیں دے رہا کہ میں نے ابھی پوری تحقیق نہیں کی۔ لیکن اگر یہ سچ ثابت ہو تو پھر تمہارا کیا خیال ہے۔ اگر کوئی ایسا واقعہ ہوتا جو میری تمہاری پہلی ملاقات سے پہلے کا ہوتا تو میں اسے بھول جاتا۔ بلکہ بھول گیا ہوں۔ کیونکہ میں بہت پہلے سے ہونے والے معاشقے کے متعلق بھی سن چکا ہوں۔ مگر میرے ساتھ رشتہ استوار کرنے کے بعد اس قسم کی حرکت میری برداشت سے باہر ہے۔"

"پتہ نہیں آپ کو کون آوارہ لوگ اس قسم کی باتیں بتاتے ہیں ان کا اپنا کریکٹر ایسا ہو گا۔ شریفوں پر کیچڑ اچھالنا کہاں کی شرافت ہے"

"جو کچھ تم کہہ رہی ہو اس کی قسم دے سکتی ہو۔"

"مجھے آپ کی قسم"

"میں تو کوئی چیز نہیں ہوں۔ میرا تمہارا تو کوئی واسطہ ہی نہیں رہا۔

میری قسم تو مذاق ہوئی۔ کسی عزیز چیز کی قسم کھاؤ

"آپ ویسے ہی مجھ پر یقین کر لیں۔"

"میں تو اس کے لیے بھی تیار ہوں مگر اگر کبھی تم نے میرے اعتماد کو دھوکا دیا تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہو گا۔ منظور ہے؟"

"ہاں — لائیے اب ہاتھ صلح کر لیں"

"نہیں" میں نے اپنا ہاتھ پیچھے ہٹا لیا۔ "ابھی نہیں۔ وہ لڑائی تو اپنی جگہ ہے۔ تم نے مجھے ناراض کر کے بھیجا تھا اور پھر ایک خط بھی نہ لکھا۔ چند معذرت کے الفاظ ہی لکھ کر بھیج دیتیں۔"

"آپ اس دن جو سلوک میرے ساتھ کر گئے تھے آپ نے اس کی معذرت چاہی تھی۔ اگر مجھے کچھ ہو جاتا تو؟"

"میں تو اپنی حرکت پر واقعی بے حد پشیمان ہوا تھا۔ میں خود چاہتا تھا کہ شادی سے پہلے مجھ سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو۔ میں نے تو اسی وقت تمہیں لکھ بھیجا تھا۔"

"بس اتنا سا"

"اور کیا تفصیل لکھتا کہ کیسے ہو گیا۔ اگر وہی رقعہ کسی اور کے ہاتھ آ جاتا تو پھر؟"

"آپ لکھ دیتے" وہ ہنسنے لگی

"تم باقاعدہ رسید چاہتی تھیں" میں نے غصے سے کہا۔

"ہاں" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "میرے ساتھ کچھ ہو جاتا تو آپ

گریبان پکڑنے والی بنتی۔"

"اگر تم اسی میں خوش ہو تو لو اب پکڑ لو" میں اس کے اور قریب ہو گیا۔ وہ مجھے دیکھ دیکھ کر ہنستی رہی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر چوم لیا۔ میں نے اس کا سر اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا اور اس کے بالوں میں آہستہ آہستہ کنگھی کرنے لگا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اس کی آنکھوں میں پیار کے شبنمی آنسو چمک رہے تھے۔ میرے پیاسے لبوں نے آنکھوں کی اس شبنم کو چوس لیا۔

○

میں خوش تھا کہ یہ بات بڑھنے نہیں پائی تھی۔ مگر ایک کانٹا ابھی تک میرے دل میں کھٹک رہا تھا۔ میرے واپس آنے پر وہ کچھ مغموم سی ہو گئی تھی۔ وہ چپ چپ سی اور اداس لگ رہی تھی اور میں اسے اسی حالت میں چھوڑ کر چلا آیا تھا۔ مگر جانے میرا یہ احساس کیوں جاگ رہا تھا کہ وہ سچ مچ اداس نہیں ہے۔ محض مجھے دکھانے کے لیے یہ بہروپ بھر رہی ہے۔ اس کی وفا اب بھی مشکوک تھی۔ میں نے سوچا اگر وہ میرے لیے سچ مچ اداس رہنے لگے تو مجھے کتنی خوشی ہو۔ میں اس سے بے حد محبت کرنے لگ جاؤں۔ مگر اس کی وفا کا رنگ مجھے اڑا اڑا سا کیوں لگ رہا تھا۔ شاید یہ میرا ہی کوئی احساس ہو۔ میں اپنی خیالات میں گم فرلانگ ڈیڑھ فرلانگ آگے بڑھ آیا تھا۔ اچانک بجلی کے کوندے

کی طرح یہ بات میرے ذہن میں چمکی کہ اسے چیک کرنا چاہیے۔ اگر وہ میری غیر موجودگی میں بھی اسی طرح اداس بیٹھی ہو گی تو میں اپنے آپ کو بے حد خوش قسمت سمجھونگا۔ میں وہیں سے واپس مڑا۔ اور دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھتا اس کے دروازے کے سامنے رک گیا۔ میں نے سانس روک کر اندر جھانکا۔ میرا رنگ اڑ گیا۔ وہ بڑے سکون سے بیٹھی اپنا کام کر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ذرا سی بھی پریشانی نہیں تھی۔ وہ بے حد پر سکون نظر آ رہی تھی۔ میرے دل کو ایسا دھچکا لگا کہ میں سنبھل بھی نہ سکا۔ مجھے بڑا دکھ ہوا۔ اس نے مجھے پوچھا بھی نہیں کہ آپ کیوں واپس آ گئے ہیں۔ میں اسے کوئی خاص جواب نہ دے سکا۔ وہ کہنے لگی:۔

"آپ دیکھنے آئے ہوں گے کہ کون میرے پاس بیٹھا ہے۔" وہ ہنسنے لگی۔ میں پریشان سا اسے دیکھتا رہا۔ پھر میں جلد ہی واپس آ گیا۔

O

اس کے اس رویے سے مجھے پھر تشویش لاحق ہو گئی تھی۔ کچھ دیر پہلے میرا دل آئینہ کی طرح بالکل صاف ہو گیا تھا مگر اب وہ پھر ایک ہی جھٹکے سے چکنا چور ہو گیا تھا۔ میں مزید تفصیلات کے لیے جد وجہد کرنے لگا۔ مجھے کئی دن اسی کام میں لگ گئے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی غلط فہمی کی بنا پر اپنی اور اس کی زندگی پر خطر راستوں پر ڈال دوں۔ کافی جد وجہد کے بعد مجھے ایک ذرا سا سراغ ملا۔ مجھے صرف یہ بتایا گیا کہ آج کل

ایک کار آکر رُکتی ہے اور پھر وہ اجنبی گھنٹوں اس کے پاس بیٹھا رہتا ہے۔ میرے شک کے لیے یہ بات کافی تھی۔ بھلا عام آدمیوں کو کیا پڑی ہے کہ وہ گھنٹوں اس کے پاس بیٹھا رہے۔

مجھے یہ سُن کر اتنا دُکھ نہیں ہوا کیونکہ اب میں نے بینا کو چھوڑ دینے کے لیے آخری فیصلہ کر لیا تھا۔ میں نے اب بینا سے بات کرتے وقت شائستگی کا اتنا خیال نہ رکھا جتنا میں رکھا کرتا تھا۔ میرا دل تو جلا ہوا تھا۔ میں بدلتے حالات کا ستایا ہوا اس کے پاس پہنچا اور درا در کرخت لہجے میں پوچھا:۔

" تمہارے پاس کوئی نوجوان آیا کرتا ہے۔"

" نہیں "

" پھر سوچ لو "

" میرے پاس تو کوئی بھی نہیں آتا۔"

" میں نے تو بہت جتن کیے مگر تمہاری گھٹی سے جھوٹ نہ نکلا۔"

" کار پر تمہارے پاس کون آیا کرتا ہے ۔ ۔ ۔ وہ جو گورا سا لڑکا ہے۔"

" مجھے تو نہیں پتہ "

" بکو مت "

وہ حیران سی میرا منہ دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔

" اب چپ کیوں ہو گئیں۔ بتاتی کیوں نہیں "

" آپ شاید رُدقی کے متعلق کہہ رہے ہیں۔ وہ تو شمیم کو لینے کے

لیے دو ایک مرتبہ یہاں آیا ہے۔"

اس نے اپنا کچھ نہ کچھ جرم تسلیم کر لیا تھا۔ میں نے اب ٹوٹی ہوئی کڑیاں ملانا شروع کر دیں۔ شمیم ہم سے ایک سال پہلے یونیورسٹی آیا کرتی تھی پھر وہ تعلیم کو راہ میں ہی چھوڑ کر فرار ہو گئی تھی۔ شاید اس کی وجہ اس کا عشق ہو۔ رُوفی ان کے مکان کے سامنے ہی رہتا تھا۔ اس کا رُوفی سے عشق کا سلسلہ دیر تک چلتا رہا تھا۔ پھر دونوں کے والدین کو علم ہو گیا تھا۔ شمیم کے گھر والوں نے رُوفی کے ہاں رشتہ کا پیغام بھیجا تھا مگر انہوں نے انکار کر دیا تھا۔ نہ صرف انکار کر دیا تھا بلکہ رُوفی پر اپنی گرفت مضبوط کر دی تھی۔ دونوں کے راستوں میں پھولوں کی بجائے کانٹے دار جھاڑیاں آگئی تھیں۔ شمیم مینا اور نوید کی سہیلی تھی۔ مینا کو پتہ چل چکا تھا کہ رُوفی شمیم سے کٹ گیا ہے۔ اس لیے وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ اور مینا کی اس کامیابی کے بعد میں بھی باخبر ہو گیا تھا۔

اب میرے لیے مسئلہ یہ تھا کہ میں رُوفی کے متعلق مکمل واقفیت حاصل کروں۔ مجھے اس کی کار تک کا نمبر معلوم نہ تھا۔ یہ کوشش میں کئی دنوں سے کر رہا تھا۔ لیکن مجھے پتہ ہی نہ چل رہا تھا۔ پھر اچانک ہی چند کڑیاں ملانے میں مجھے کچھ کامیابی ہو گئی۔ میں کچھ کچھ پُر اُمید ہو گیا۔

مینا نے تو یہ بات کہہ کر اپنے کندھے سے بوجھ اتار دیا تھا مگر اس نے میرے لیے ایک نئی راہ ہموار کر دی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو ایڈگر ایلن کے کردار پر ڈھال لیا اور اس مہم کی طرف مکمل توجہ مبذول کر دی۔ مجھے

اب پو کی طرح اس مسئلہ کو حل کرنے میں زیادہ وقت نہیں ہوئی۔ مجھے سب سے پہلے شمیم کا گھر ڈھونڈنا تھا۔ وہ مجھے بغیر وقت کے مل گیا وہیں سے مجھے کار کے نمبر کا بھی پتہ چل گیا۔ اور پھر رُوبی اس کے دفتر اور باقی حالات کا پتہ چل گیا۔

میں نے مینا سے پوچھا

"وہ تمہارے پاس اتنی دیر کیوں بیٹھا رہتا تھا"

"ایک دفعہ مرض دکھانے آیا تھا"

"دل کا مرض ہو گا"

وہ خاموش میرا منہ تکتی رہی۔ میں نے کہا:۔

"پہلے تو تم نے کہا تھا کہ وہ یہاں کبھی آیا ہی نہیں۔ پھر تم نے کہا کہ وہ شمیم کو ملنے ایک دو دفعہ آیا ہے۔ اب تم کہہ رہی ہو کہ وہ ایک دفعہ مرض دکھانے آیا تھا۔ کیا تمہارا اپنا بیان ہی تمہاری چوری کی نشان دہی نہیں کر رہا۔"

"میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔"

"تو پھر وہ تو بار کیوں پاس آتا ہو گا"

"میں اس راز کو افشا نہیں کرنا چاہتی"

میں نے اپنا ریوالور میز پر رکھتے ہوئے کہا:۔

"اس وقت اس میں چھ گولیاں ہیں۔ تم یہ بات یاد رکھو کہ جو بات میں ایک دفعہ کہہ دوں اسے پورا ضرور کیا کرتا ہوں۔ اور آج تمہیں

میں کچھ الفاظ میں کہے دیتا ہوں کہ اگر میں نے تمہیں کسی ایسے نوجوان سے دیکھ لیا تو یہ گولیاں ہوں گی اور تمہارا یہ حسین بدن ہو گا جس پر تم مان کرتی ہو۔"

"میں ڈرتی تو نہیں۔"

"میں تمہیں ڈرانا بھی نہیں چاہتا۔ میں نے تو ایک حقیقت بیان کی ہے۔"

"آپ ابھی مار لیں"

"وقت آنے دو۔ بہر حال تم میری تاک میں رہنا۔ میں تمہاری تاک میں ہوں۔"

"میں اکیلی تو نہیں مروں گی۔ آپ کو بھی ساتھ لے کر مرونگی۔"

وہ تو مجھے نظر آ ہی رہا ہے۔ بہر حال یہ سودا بھی زیادہ مہنگا نہیں ہوگا۔ اب میں جا رہا ہوں۔"

میں غصّہ میں سیڑھیاں نیچے اُتر آیا۔ اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

O

میں سخت الجھن میں مبتلا تھا!!

میں مضطرب تھا اور پریشان بھی۔ خوف، مایوسی اور ناکامی کے اثرات میرے چہرے پر نمایاں ہونے لگے تھے۔ میں حیران تھا کہ اگر اس نے مجھے چھوڑ ہی دیا ہے تو پھر میرے خطوط اور دوسری تحریریں واپس کیوں نہیں کرتی۔ کیا اس سے میں یہ مطلب لے لوں کہ وہ مجھ سے اب

بھی محبت کرتی ہے ۔ اگر ایسا ہے تو پھر وہ رُوفی سے کیوں ملنے لگی تھی ۔
میں عجیب مخمصہ میں پھنس گیا تھا ۔ میری ذہنی قوتیں مجھے جواب دے گئی
تھیں ۔ میں نے ہر پہلو پر غور کیا تھا ۔ شاید وہ مجھے پریشان کرنا چاہتی
ہے ۔ یا شاید مجھے بلیک میل کرنا چاہتی ہے ۔ اس نے ایک دفعہ کہا تھا ۔

" اگر آپ کہیں اور شادی کریں گے تو میں آپ کی اُمی سے کہہ دوں گی "

" کیا ؟ "

" کہ آپ میری زندگی تباہ کر چکے ہیں "

" معاوضہ لے لو "

" کیا ؟ "

میں نے دو مختلف بنکوں کی بنک چیک بکیں دستخط کرنے کے بعد اس کے سامنے پھینک دیں ۔

" جو جی چاہے لکھ لو "

" سارا بینک بیلنس ختم کر دوں "

" پھر بھی یہ سودا مہنگا نہیں رہے گا "

" آپ مجھے خریدنا چاہتے ہیں ۔ "

" میں تمہیں کیسے سمجھاؤں بینا "

" مجھے مزا آ رہا ہے "

" مجھے پریشان دیکھ کر "

" ہاں "

میں پریشان سا ہو کر خاموش ہو گیا۔ میں نے اسے کہا۔
"میں تمھیں مار دونگا"
"مار دیجیے۔ اس سے بڑی خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی ہے۔"
میں نے بھرا ہوا ریوالور نکالا اور اس کے سینے کو اپنی نشست میں لے لیا۔ وہ اور بھی تن کر کھڑی ہو گئی۔ سینہ اس نے ذرا آگے کر دیا۔
"چلائیے گولی" وہ ہنسنے لگی۔
"یہی تو مصیبت ہے" میں تم پر گولی نہیں چلا سکتا۔ تم میرے پیار کی نشانی ہو۔ مجھے وہ حسین لمحات یاد آ جاتے ہیں جب تم صرف میری تھیں"
میں نے ریوالور جیب میں ڈال لیا اور گم سم بیٹھ گیا۔ مجھے جانے کیوں عتیق یاد آنے لگی۔ کتنی بھولی بھالی تھی۔ کتنی پیاری تھی وہ۔ کتنی سیدھی سادھی۔ میری ہر طنز ہر تلخ بات کو کس قدر خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتی تھی۔ وہ با وفا تھی میرا جی چاہ رہا تھا کہ وہ آج مجھے پھر مل جائے۔ میں اسے ہمیشہ کے لیے اپناؤں۔ مگر جانے وہ مجھ سے کیوں روٹھ گئی تھی۔ مجھے تو آج تک یقین سا تھا کہ وہ میرے ساتھ بیوفائی نہیں کر سکتی۔ وہ کتنے ہی عرصے سے مجھ سے علیحدہ تھی مگر جانے مجھے آج تک اس پر اعتماد سا کیوں تھا۔ میں اس سے ایک دفعہ ایسا الگ ہوا تھا کہ پھر ہم مل ہی نہ سکے تھے۔ وہی بات تھی کہ ؎

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر ہو کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

مینا نے کھنکتی ہوئی ہنسی سے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

"آپ گھر والوں سے ڈرتے ہیں کہ کہیں جائیداد سے عاق نہ کر دیں۔"

"شاید۔ لیکن تم مجھے مجبور نہ کرو کہ میں کوئی اُلٹا قدم اٹھاؤں"

وہ ہنسنے لگی۔ "اٹھائیے۔ کتنی حسین موت ہو گی۔ آپ کے ہاتھ سے گولی چلے تو میری روح ہمیشہ سکون سے رہے گی۔"

"واقعی؟"

"جھوٹ تو نہیں کہہ رہی"

میں نے ریوالور نکال لیا۔ وہ پہلے کی طرح تن کر کھڑی ہو گئی۔ مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے مصنوعی انداز سے مسکراہٹ کو دبانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"گریبان کے بٹن کھول دو"

"کیوں؟" اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے

"ذرا گولی کو تکلیف نہیں ہو گی۔ عنایت ہو گی"

"ٹھہریئے" وہ مسکرا رہی تھی۔

"کیوں؟"

"چند لمحوں کے لیے گولی صاحبہ کو ذرا روکیے"

"کیوں؟"

"میں ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں"

"فرمائیے"

"آج کل آپ کوئی نیا رومان لڑا رہے ہیں"

"نہیں. لیکن ارادہ ہے۔"

"پھر پورا کیوں نہیں کر ڈالتے"

"دراصل میں تذبذب میں پڑ جاتا ہوں"

"وہ کیوں؟"

میں چاہتا ہوں وہ لڑکی بھی محبت میں اتنی ہی سنجیدہ ہو جتنا کہ میں ہو جاتا ہوں مگر میرے ساتھ ٹریجڈی یہ ہے کہ لڑکیاں سرسری سی محبت کرتی ہیں۔ کبھی کبھی تو میں بھی ایسی ہی محبت کے لیے اپنے آپ کو آمادہ کرتا ہوں مگر مصیبت یہ ہے کہ میں بے حد مخلص ہو جاتا ہوں۔ یہ میری فطری کمزوری ہے۔ اس لیے مجھے ہمیشہ زک اٹھانا پڑتی ہے۔"

"معلوم ہوتا ہے آپ کافی تجربے کر چکے ہیں۔"

"ہو ہی رہے ہیں"

"اب نظر اجو کی طرف تو نہیں جا رہی۔ وہ تو اب کافی دلیر ہو چکی ہے۔ سب کے سامنے مسعود سے مل لیتی ہے۔ ایک دن وہ دونوں اکیلے بیٹھے تھے کہ نوید وہاں سے گزری مگر اس نے پرواہی نہیں کی۔ خاصی دلیر لڑکی ہے۔"

"تمہاری سہیلی جو ہوئی۔ رفاقت کا اثر تو چپکے چپکے سرایت کرتا ہی رہتا ہے۔"

"آپ نے غلط اندازہ لگایا۔ میں تو بے حد ڈرپوک ہوں۔"

"اسی لیے خط نہیں دے رہی ہو"

"میں دینا ہی نہیں چاہتی"

"لیکن کیوں؟"

"یہ میری محبت کی یادگار ہیں"

"تم نے واقعی مجھ سے محبت کی تھی"

"بس ہو گئی تھی"

"اب"

"اب پھر ہو رہی ہے"

"کس کے ساتھ؟"

"یہی تو آپ سمجھتے نہیں"

"میرا خیال ہے اب تم بجھارتوں کا سلسلہ ختم ہی کر دو"

"میں خط آپ کو کبھی بھی نہیں دوں گی"

"کیا تم مجھے واقعی چاہتی ہو"

"ہاں"

"قسم کھاؤ"

"آپ کی قسم"

"نہیں کوئی عزیز ترین قسم کھاؤ"

"قرآن مجید کی قسم"

"قرآن مجید کی قسم تو عقیدت مند لوگوں کے لیے ہوتی ہے تم تو میری طرح ہی بے عمل ہو"

"مسلمان تو ہوں"

"دل جو کافر ہے"

"آپ مجھ پر ویسے ہی یقین کر لیں"

"نہیں"

"تو قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر کہہ دوں"

"اگر تمہیں قرآن مجید کی حرمت کا واقعی احساس ہے تو ٹھیک ہے"

"قرآن مجید لائیے"

اوپر جا کر لے آؤ۔ میرے پاس کہاں ہے"

"نہیں آپ لائیں"

"بازار سے لے آؤں"

"آج رہنے دیں کل لے آئیں۔ آئیے اب صلح کر لیں۔"

"کتنے وقت کے لیے"

"ہمیشہ کے لیے"

"دیکھو بٹیا یہ صلح آخری ہو گی اگر پھر تم نے مجھے دھوکا دیا تو نتائج بڑے خطرناک ہوں گے۔ وعدہ کرو"

"وعدہ"

"پکا وعدہ"

"پکا وعدہ"

○

اگلے دن میں دبے پاؤں پہنچا تو وہ میرا ہی انتظار کر رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"آپ دبے پاؤں اس لیے آئے ہیں کہ مجھے پکڑ سکیں"

"لیکن آج کا تو تمہیں پتہ تھا کہ میں آ رہا ہوں"

"یہ کیا لائے ہیں"

میں نے دونوں ریوالور میز پر رکھ دیے۔

ایک تمہارا ہے اور ایک میرا۔ میں چاہتا ہوں کہ اگر تم کبھی کوئی فحش غلطی کر بیٹھو تو اپنے آپ کو خود ہی گولی مار لو۔ مجھے یہ زحمت گوارا نہ کرنا پڑے۔ ورنہ مجبوراً مجھے تو پھر اسے چلانا ہی ہو گا۔"

وہ سنجیدگی سے میری طرف دیکھتی رہی۔ میں نے کہا:۔

"تم نے روفی سے کیسے تعلقات استوار کر لیے تھے۔ کیا تم مجھے بھول گئی تھیں۔"

"ہاں"

"تم نے سمجھا ہو گا میں تمہیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ چکا ہوں"

"ہاں"

"تم ان وعدوں کو کیسے بھول گئیں جو تم میرے ساتھ کیا کرتی تھیں۔"

"اب چھوڑیے ان باتوں کو"

"بینا میں تمہیں ایک آخری بات کہنے آیا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ تم میرے لیے روفی کو چھوڑ دو۔ اگر تم سمجھتی ہو کہ تمہاری زندگی اس کے ساتھ بہتر گزر سکتی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اس کے بعد ہم دونوں

اچھے دوستوں کی طرح ملتے رہیں گے۔ تم پسند کرو تو تمہاری شادی کے اخراجات بھی میں پورے کر دونگا۔"

میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ میرا بینا کے ساتھ نبھاؤ نہیں ہو سکے گا۔ مجھے وہ پروفیشنل لڑکی نظر آ رہی تھی۔ بھلا وہ بھی کوئی لڑکی ہے جو اپنی سہیلی کے عاشق سے سہیلی کی ناکامی پر معاشقہ شروع کر دے۔ میرے دل سے ایک نفرت کی لہر سی اٹھی اور اس نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ مجھے بغور دیکھ رہی تھی۔ میں اپنے ذہنی کرب کو چھپا نہ سکا۔ میں نے اسے کہا۔

"کیا واقعی تمہارے کسی لڑکے کے ساتھ تعلقات نہیں رہے"

"نہیں" اس نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔

میں تو پہلے ہی جلا بیٹھا تھا۔ میں نے کہا

"قرآن حکیم پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتی ہو"

"نہیں"

"لیکن تم نے تو قسم کھانے کا وعدہ کیا تھا"

"میں کسی ایسے وعدے کو نہیں جانتی۔

"بینا تم یہ بھول رہی ہو کہ تم نے مجھے تباہ کر دیا ہے اور میں اس تباہی کی قیمت وصول کرنا خوب جانتا ہوں"

"آپ مجھے آوارہ سمجھتے ہیں"

"آوارگی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو گا کہ تم نے کسی نامحرم سے تعلقات بڑھائے۔"

"یہ بہتان ہے۔ سراسر جھوٹ ہے۔"

"تم تو باتوں ہی باتوں میں خود اپنے اس جرم کو تسلیم کر چکی ہو۔"

"یہ بھی غلط ہے"

"تو پھر تم قرآنِ حکیم پر ہاتھ رکھ کر قسم کیوں نہیں کھا لیتیں۔"

"میں ایسا نہیں کروں گی"

"مینا تمہیں ایسا کرنا ہو گا"

"یہ کبھی نہیں ہو گا"

"مینا یہ ہو گا، اور ہر قیمت پر ہو گا"

"ایسا نہیں ہو گا"

"پھر سوچ لو"

"مجھے اس کی ضرورت نہیں۔"

"پھر تم نے وعدہ کیوں کیا تھا"

"میں نے کوئی وعدہ نہیں کیا"

"کمینگی کی حد ہے۔ یہی تمہارا کردار ہے"

"آپ کا کیا کردار ہے"

"میں تمہاری طرح آوارہ تو نہیں"

"آوارہ نہیں تو اور کیا ہو"

اور اس کا چہرہ غصّہ کی تیزی میں سُرخ ہو گیا۔ اس نے ریوالور اٹھا لیا۔ میرے ذہن میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ سچ مچ ایسا کوئی واقعہ

ہو سکتا ہے۔ میں نے اپنے انتہائی غصّہ پر قابو پاتے ہوئے سنبھلنے کی کوشش کی۔ میں نے کہا۔

" مینا! رکو! کیا کر رہی ہو۔ پاگل ہو رہی ہو "

لیکن اس نے میری بات نہیں سنی۔ اپنی دانست میں وہ ریوالور کو بند کواڑ کھول کر اندر پھینک چکی تھی مگر وہ دہلیز میں ہی گر گیا تھا۔ میں نے اسے پھر کہا۔

" مینا انسان بنو "

مگر وہ غصّہ سے دیوانی ہو رہی تھی۔ اس نے نوید کو آواز دی

" نوید ریوالور پکڑو۔ بلاؤ پولیس کو "

نوید کسی دوسرے کمرے میں تھی اور اب وہ شور کی آواز سن کر ملحقہ کمرے میں پہنچ چکی تھی۔ میں غصّہ سے ایکدم آتش فشاں بن گیا۔ اس چھینا جھپٹی سے مجھے فراغت ملی تو میری نظر اچانک میز پر پڑی۔ دوسرا ریوالور ابھی تک وہاں پڑا تھا۔ واقعات اتنی تیزی سے گزر رہے تھے کہ مجھے ابھی تک اپنے کا خیال ہی نہ آیا تھا۔ میں نے تیزی سے ریوالور پکڑا۔ مینا سامنے کے دروازے سے بھاگنے کی کوشش میں تھی کہ میں تیزی سے دروازے کے آگے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اور مجھے خود پتہ نہ چلا کہ میں نے کیسے اور کس وقت لبلبی دبا دی ہے۔ ایک لمحہ کے بعد میرے ہاتھ میں خالی ریوالور تھا۔

زنداں روتا ہے

دلوں پر نقشِ ثبت کر دینے والی اور روح کی

گہرائیوں میں اتر جانے والی داستاں ۔

اختر سلیمی

نے اردو ادب کو نئے کرداروں سے روشناس
کرایا ہے۔

زنداں روتا ہے۔

اپنی طرز کی اچھوتے انداز میں نہایت دلچسپ داستاں ہے

حسن کار ○ لاہور